التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۹، شمارہ ۱۸، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

''مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ......سیاسی اور نظریاتی کردار''

(پاکستان کی تاریخ اور سیاست کے تناظر میں)

ڈاکٹر محمد شکیل صدیقی

On aspect of the work and endeavors of great scholar,Syed Abul Aala Maudoodi multidimensional personality is the writing on the history and politics of Pakistan. He played a dynamic and active role during Pakistan movement and after the foundation of Pakistan. The present articale has thoroughly delineated the services and role of the great scholar in Pakistan movement; same is the title of the article.

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بیسویں صدی کے ایک معروف مفسر، محدث، فقیہ، مفکر، مورخ اور متکلم ہیں۔ ان کی سیرت وکردار اور خدمات اور کارناموں کی جہات اس قدر متنوع، مبسوط اور ہمہ گیر ہیں کہ اگر کوئی صاحب نظر ایک جملے میں احاطہ کرنا چاہے اور ان کے مقام ومرتبے کا تعین کرنے کی کوشش کرے تو یہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا تاہم مولانا مودودیؒ کے

علمی کارناموں اور عملی جدوجہد کو مربوط ومرتکز کرکے ان کی پہچان اور شناخت متعین کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ مولانا مودودیؒ بنیادی طور پر ایک مصلح اور مجدد تھے۔ جنہوں نے اپنی پوری زندگی جسم وجان اور قلب وذہن کی کل صلاحیتوں اور توانائیوں کو احیائے دین اور اقامت دین کے لیے وقف کردیا۔ انہوں نے اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات، ابتلاء وآزمائشوں کا سامنا ومقابلہ، اسلاف کے مومنانہ کردار ووقار، صبر واستقلال اور عزیمت واستقامت کی شاندار روایت کے مطابق اس طرح کیا کہ وہ آج تک تاریخ میں سرخرو ہیں اور ان کے اثرات میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔

حکومت وسیاست، ریاست کا بنیادی موضوع اور دین کا جزو لاینفک ہے اسی لیے مولانا مودودیؒ نے بھی سیاست کو دین کے جزو کے طور پر اپنی فکر وعمل کا موضوع بنایا انہوں نے ایک ماہر متکلم کی حیثیت سے اسلامی سیاسی افکار ونظریات کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں جدید مغربی تہذیب وافکار کے مقابل ایک قابل عمل اور موثر طاقتور نظریہ کے طور پر پیش کرکے سیاست ومعاشرت میں مغرب کی فسوں کاری کو بے نقاب کیا تو دوسری طرف تحریک پاکستان اور مملکت پاکستان کو فکری ونظریاتی اساس فراہم کرنے میں علمی اور عملی طور پر اپنا کردار ادا کیا، مولانا مودودیؒ ایک عالم باعمل مسلمان مفکر تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کی سیاست اور سیاسی نظریات ایک بے عمل فلسفی کا فلسفہ نہیں اور نہ ہی زندگی سے کٹے ہوئے درویش کی ریاضت ہے بلکہ انہوں نے دین کا جو فہم حاصل کیا اسے دوسروں تک پہنچانے اور اسے اللہ کی زمین پر نافذ وغالب کرنے کی تنہا واجتماعی کوششیں بھی کیں اس ضمن میں مولانا مودودیؒ نے احیائے دین اور اقامت دین کے فریضے کو ایک منظم اجتماعی تحریک کی شکل دی اور ایک جماعت، ''جماعت اسلامی'' قائم کی ہے وہ اس جماعت کے بانی امیر تھے، مولانا مودودیؒ نے تقسیم کے بعد ہندوستان سے ہجرت کرکے پاکستان میں سکونت اختیار کی ہے اور پاکستان کی قومی سیاسی تاریخ کی ابتدائی تین دہائیوں میں مستعد اور فعال کردار ادا کیا۔

تحریک پاکستان اور پاکستان کی قومی سیاست میں مولانا مودودیؒ کا سیاسی نظریاتی کردار زیر نظر مقالہ کا موضوع ہے۔

باور کرانے کی کوشش کی کہ ہندوستان قوم پرستی کا واحد اور بلاشرکت غیر مادی مظہر ہے، ہندوستان میں ہندو مسلم سوال، چند مسلمان دانشوروں، زمینداروں اور سرمایہ داروں تک محدود ہے، جو اسے ایک ایسا فرضی مسئلہ بنا رہے ہیں جس کا کوئی وجود حقیقتاً عوام کے ذہن میں نہیں ہے، کانگریس نے اقتدار میں مسلم لیگ کو حصہ دار بنانے سے انکار کے ساتھ ساتھ لیگ کے خلاف حکمت عملی کا ایک اور رخ بھی اختیار کیا۔ مسلم لیگ کو اقتدار سے باہر رکھنا ہی کافی نہیں، عوام میں اس کی طاقت کو کمزور اور بالآخر اسے بالکل ختم کر دینا چاہیے، کانگریس اپنی رابطہ عوام مہم کے ذریعے یہ کوشش کر رہی تھی مسلم اتحاد کو تباہ کرکے مسلم ملت میں انتشار پیدا کردے، بنیادی ہندومت پر مبنی ودھا اور ودیا مندر تعلیمی اسکیم جاری کی گئی جس کا واحد مقصد مسلمانوں کی دینی، ملی اور تہذیبی اساس کو منہدم کرکے ہندی تہذیب کی عمارت کی تعمیر تھا اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ایک اور کاری وار زبان و رسم الخط پر بھی کیا گیا اور ہندی کو قومی زبان بنانے کی تحریک شروع کی گئی ہندی زبان کی آڑ میں دراصل متحدہ ہندی قومیت کے مقاصد کو پورا کرنا تھا۔ متحدہ قومیت کی بنیاد پر وطنیت کی تحریک کا سب سے المناک پہلو یہ تھا کہ کانگریس کو مسلمان قوم پرستوں کے ایک ایسے گروہ کی تائید بھی حاصل ہوگئی تھی جو متحدہ قومیت پر مبنی وطنیت کے تصور کو اپنے مفاد کے مطابق سمجھتے تھے اس کانگریسی تحریک میں عام مسلمانوں کے ساتھ علماء کا ایک مکتبہ فکر بھی متحدہ قومیت کا علمبردار بن کر سامنے آیا جس نے کہا کہ "فی زمانہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔" ع

یہ وہ حالات تھے جس میں مولانا مودودیؒ اسلامی قومیت کے نقیب بن کر سامنے آئے، انہوں نے علمی، عقلی، تہذیبی اور تاریخی پہلوؤں سے ثابت کیا کہ مسلمان اور ہندو الگ الگ قومیں ہیں، دونوں کا تصور خدا، مذہبی عقیدہ، رہن سہن اور طور طریقے سب جدا ہیں انہیں ایک قوم کہنا بالکل غلط ہے۔ مولانا مودودیؒ نے تحریک پاکستان کی جدوجہد کے اس نازک اور فیصلہ کن موڑ پر واضح کیا کہ:

"ہندوستان میں جو تہذیبی قومیں پائی جاتی ہیں انہیں کوئی ایسا شخص متشابہ الاخلاق نہیں کہہ سکتا جو اجتماعیت میں کچھ بھی بصیرت رکھتا ہو جو سیاسی خواہشات سے قطع نظر کرکے محض حقائق نفس الامری کی بناء پر رائے قائم کرتا ہو۔ ان قوموں کے درمیان اس سے زیادہ اختلافات پائے

پاکستان کی تاریخ اور سیاست میں مولانا مودودیؒ کے کردار کا درج ذیل تین حصوں میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

اول .... قیام پاکستان سے قبل تحریک پاکستان میں کردار۔

دوم .... قیام پاکستان کے وقت مسائل ومشکلات کے حل میں حصہ۔

سوم .... قیام پاکستان کے بعد قومی سیاست میں کردار۔

تحریک پاکستان: تحریک پاکستان میں مولانا مودودیؒ کا کردار خالصتاً علمی وفکری اور نظریاتی ہے، تحریک پاکستان میں ایک ایسا موڑ بھی آیا جب دوقومی نظریہ کے بارے میں تشکیک اور وسوسہ پیدا کرنے کی سازشیں کی گئیں یہ سازشیں اتنی گہری تھیں کہ اگر ان کا بروقت تدارک نہ کیا جاتا تو خود ملت اسلامیہ اس سازش کا شکار ہوجاتی اور ایک آزاد اسلامی مملکت کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوتا اس نازک اور فیصلہ کن موڑ پر مولانا مودودیؒ نے دوقومی نظریہ کے خلاف حملوں کا نہ صرف دفاع کیا بلکہ ان داخلی وخارجی قوتوں کے عزائم کو ناکام بنایا جو پاکستان کی فکری اور نظریاتی اساس کو کمزور ومنہدم کرنا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے ہم تحریک پاکستان کی فکری اور نظریاتی جدوجہد میں مولانا مودودیؒ کے کردار کا اجمالی جائزہ لیں گے۔

.........۱۹۳۷ء میں جب ہندوستان میں آئین حکومت مجریہ ۱۹۳۵ء کے تحت ملک گیر انتخابات منعقد ہوئے ان انتخابات میں انڈین نیشنل کانگریس نے گیارہ میں سے آٹھ صوبوں میں کامیابی حاصل کرلی ف۔ انتخابات میں کانگریس کی کامیابی کے کیا معنی تھے؟ یہ ایک الگ اور تفصیلی موضوع ہے تاہم انتخابی نتائج سے یہ ثابت ہوگیا کہ مخلوط انتخابات، ہندو اکثریت کے ذریعے مسلم اقلیت کو محکوم بنانے کی سازش ہے، کانگریس نے کامیابی کے بعد نہ صرف حکومت سازی میں مسلم لیگ کو یکسر نظر انداز کیا بلکہ مسلمانوں کی وحدت واکائی کو تحلیل کرنے کی پروپیگنڈہ مہم شروع کی، کانگریس نے ایک طرف تو ۱۹۳۵ء کے دستور میں اقلیتوں کو حاصل سیاسی، اقتصادی اور مذہبی حقوق کے تحفظ کی تنسیخ کا مطالبہ کیا تو دوسری طرف مسلم لیگ کو نظر انداز کرکے تنہا حکومت سازی کی، کانگریس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فتح کے غرور وتکبر میں اپنی سیاسی اور برہمنی حیثیت کو مستحکم کرنے پر ساری توجہ مرکوز کردی، ۱۰ مئی ۱۹۳۷ء کو جواہر لال نہرو نے مسلمانوں کو یہ

جاتے ہیں جتنے یورپ کی مختلف تہذیبی قومیتوں کے درمیان موجود ہیں یہاں عقائد بعدالحشر تین ہے، اصول تہذیب ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے، نظام اخلاق میں بین تفاوت ہے، روایات کے سرچشمے تعلی طور پر الگ الگ ہیں، جذبات واحساسات باہم متناقض ہیں اور ایک کا نیشنل ہائپ اپنے خط وخال میں دوسرے کے نیشنل ہائپ سے کوئی مماثلت نہیں رکھتا ہے۔ یہاں محض سیاسی ومعاشی اغراض کی خاطر ان مختلف قومیتوں کو مٹاکر ایک ممزوج ومخلوط قومیت پیدا کرانے کی کوشش لامحالہ وہی نتیجہ پیدا کرے گی جس کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے۔ ۷

مولانا مودودیؒ نے وطنی قومیت کے تصور کی نفی میں تاریخی دلائل پیش کیے اور کہا کہ:

"پوری انسانی تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جاسکتی کہ کوئی قوم محض وطن سے بنی ہو، آج اس زمانے میں بھی کون سی قوم ہے جو وطن سے بنی ہے؟ کیا امریکا کے حبشی اور ریڈ انڈین اور سفید فام ایک قوم ہیں؟ کیا جرمنی کے یہود اور جرمن ایک قوم ہیں؟ کیا پولینڈ روس ترکی، یونان، یوگوسلاویہ، چیکوسلواکیہ، ہنگری، فن لینڈ کسی بھی جگہ خاک وطن کے اشتراک نے ایک قوم بنائی کیا؟ انگلستان، فرانس اور جاپان میں وحدت کا رنگ خاک وطن نے پیدا کیا؟ کیا ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ یہودی جو روئے زمین کے اطراف واکناف میں منتشر ہیں کسی جگہ بھی وطنی قومیت میں جذب ہوگئے؟ ۸

مولانا مودودیؒ نے قومیت اور آزاد وطن کے تصور کو اسلام کے تصور قومیت، آزادی اور وطن سے ہم آہنگ کیا اور بغیر کسی مداہنت ومعذرت کے اپنا نقطہ نظر پوری قوت اور جرات کے ساتھ پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

"مسلمانوں کے لیے ایسی آزادی وطن کی خاطر لڑنا قطعی حرام ہے جس کا نتیجہ انگلستانی غیر مسلموں سے ہندوستانی غیر مسلموں کی طرف اقتدار حکومت کا انتقال ہو۔ پھر ان کے لیے یہ بھی حرام ہے کہ وہ اس انتقال کے عمل کو بیٹھے ہوئے خاموش دیکھتے رہیں۔ اور ان کے لیے یہ بھی حرام ہے کہ اس انتقال کو روکنے کی خاطر انگلستانی غیر مسلموں کا اقتدار قائم رکھنے میں معاون بن جائیں۔ اسلام ہمیں ان تینوں راستوں پر جانے سے روکتا ہے۔ اب اگر ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور ہندوستان میں اسلام کا وہ حشر دیکھنے کے لیے تیار نہیں جو اسپین اور سسلی میں

ہو چکا ہے تو ہمارے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم آزادی ہند کی تحریک کا رخ حکومت کفر کی طرف سے حکومت حق کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں اور اس غرض کے لیے ایک ایسی سرفروشانہ جنگ کے لیے کمربستہ ہوجائیں جس کا انجام یا کامیابی ہو یا موت۔ ۹

معروف محقق اور ادیب ڈاکٹر سید عبداللہ مولانا مودودیؒ کی وطنی قومیت کے تصور کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"انھوں نے سب سے پہلے وطنی قومیت کے علمبردار مسلم علماء وزعما کے استدلال پر زور دار تنقید کی اور یہ ثابت کیا کہ انگریزی استعمار کے خلاف جنگ درست لیکن آزادی کی صورت میں اقامت دین اور اس کے لیے ایک اسلامی ریاست کا قیام ہر شئے پر مقدم ہونا چاہیے۔ ۱۰

ڈاکٹر عبداللہ مزید کہتے ہیں کہ:

"جب سید مودودیؒ نے وطنی قومیت کے علمبرداروں کے خلاف جن میں بعض ایسے اکابر بھی شامل تھے جن کے خلوص میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا، اپنی تحریری مہم کا آغاز کیا تو بہت سے لوگ ناراض ہوئے۔ لیکن آہستہ آہستہ انہوں نے جب اپنی دلیل کا لوہا منوایا تو اکثر لوگوں کو قائل ہونا پڑا کہ سید مودودیؒ کا موقف گم گشتہ اقتدار اسلامی کی بازیابی کے لیے نقطہ نظر درست ہے .....اور واقعی یہ سوچنے کی بات ہے کہ ہندوستان میں ایک ہزار سال حکومت کرنے کے بعد، کیا مسلمانوں کی یہی حالت ہونی چاہیے تھی کہ وہ بازیابی کے بجائے ایک غیر مسلم اکثریت کے اندر .....دریا میں قطرے کی مانند .....گم ہوکر رہ جاتے"۔ ۱۱

تحریک پاکستان کے ایک معروف مورخ اور ماہر تعلیم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کانگریس کے مزائم کے خلاف مولانا مودودیؒ کے موقف کو پاکستان کے قیام کے مترادف قرار دیا وہ لکھتے ہیں کہ:

"مولانا مودودیؒ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں اور کانگریسی تحریک میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ ہماری موت اس کے لیے زندگی ہے اور اس کی موت ہماری حیات ہے نہ

صرف یہ کہ ہمارے اور اس کے قوانین ،اصولوں اور طریق کار میں کوئی قدر مشترک نہیں ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے متضاد ہیں اختلافات اس قدر وسیع ہیں کہ کسی نقطہ پر دونوں کا میل نہیں ہوتا۔ اختلافات (اس کے اور ہمارے مقاصد اور منزل کے درمیان) کی نوعیت مشرق اور مغرب کے تفاوت کی سی ہے کہ کوئی شخص پشت کیے بغیر دوسرے کی جانب نہیں جاسکتا۔

ڈاکٹر قریشی مزید رقمطراز ہیں کہ :

''مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے انڈین نیشنل کانگریس کی پالیسیوں کا جو محتاط تجزیہ پیش کیا اس سے بہت سوں کی آنکھیں کھل گئیں اگرچہ اس سے انہیں بہت زیادہ پیروکار نہیں ملے مگر اس سے بعض ذہین اور مخلص مسلمان کانگریس سے ضرور برگشتہ ہوگئے اور وہ قائد اعظمؒ کے ساتھیوں کی حیثیت سے مسلم لیگ میں سرگرم عمل ہوگئے ۔مولانا مودودیؒ کا یہ کردار اور پر واضح کیا جاچکا ہے کہ انہوں نے مسلمان دانشور طبقہ کو اس امر کا قائل کیا کہ متحدہ قومیت کا نظریہ مسلمانوں کے لیے خودکشی کے مترادف ہے ۔ بیشتر نے اس موقف کا منطقی نتیجہ یہ لیا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی واحد منزل پاکستان کا قیام ہے۔[12]

مولانا مودودیؒ نے علیحدہ قومیت کی بنیاد پر علیحدہ وطن کے تصور کو ایک علمی وفکری جہت عطا کی انہوں نے مسلم قومیت کی فکری اور تہذیبی اساس کا تعین کیا۔تحریک پاکستان میں مولانا مودودیؒ کا یہ علمی وفکری کردار تاریخ پاکستان کا ایک ناقابل فراموش باب ہے جسے کوئی بھی مورخ نظر انداز نہیں کرسکتا ہے ۔ڈاکٹر اسد گیلانی نے بجا فرمایا کہ :

''سید مودودیؒ پہلے شخص تھے جنہوں نے نظریہ پاکستان کو علمی سطح پر دلائل کے ساتھ پیش کیا اور ان دلائل کا کانگریس کے ساتھ وابستہ علماء کے پاس کوئی جواب نہ تھا اس کے بعد پاکستان کا تصور مسلمانوں میں پختہ ہوگیا اور مسلم لیگ کے علیحدہ اسلامی اور قومی وطن کی مہم کو سید مودودیؒ کے ان دلائل سے زبردست تقویت ملی ..... پاکستان کے حق میں سید مودودیؒ کی یہ زبردست خدمت ہے جو انھوں نے علمی میدان میں سرانجام دی۔ [13]

حیدرآباد سے دارالاسلام (پٹھان کوٹ) ہجرت:

مولانا مودودیؒ ۱۹۳۸ء میں مصور پاکستان علامہ اقبالؒ کی دعوت پر حیدرآباد (دکن) کو خیرباد کہہ کر پٹھان کوٹ (ضلع گورداسپور مشرقی پنجاب) دارالاسلام نامی ایک بستی میں ہجرت کر کے آگئے ۔پنجاب آنے کا مشورہ علامہ اقبال نے ۱۹۳۷ء میں مولانا مودودیؒ کو ایک ملاقات میں دیا تھا، اس کا مختصر پس منظر یہ ہے کہ :

''چوہدری نیاز علی خان جو ایک دردمند مسلمان تھے اور خدمت دین کا جذبہ رکھتے تھے انہوں نے جمال پور میں پٹھانکوٹ کے قریب اراضی لے کر ایک وقف ''دارالاسلام'' کے نام سے قائم کیا تھا، ان کی خواہش تھی کہ وہاں کوئی عالم دین بیٹھ کر اصلاح عوام اور دین کا کام کرے ، علامہ اقبالؒ کی نشاندہی پر چوہدری نیاز علی خان نے مولانا مودودیؒ سے، جو اس وقت حیدرآباد دکن سے رسالہ ''ترجمان القرآن'' نکال رہے تھے خط وکتابت کی ان کی خواہش تھی کہ مولانا مودودیؒ خود ہی اس ادارہ میں منتقل ہوجائیں اور اپنی صوابدید کے مطابق ادارے کے مشن کو چلائیں ۔ [14] مولانا مودودیؒ اقبالؒ کی خواہش کے مطابق دارالاسلام منتقل ہوگئے۔

۱۹ شعبان ۵۷ھ بمطابق اکتوبر ۱۹۳۸ء بروز جمعہ ،اسکیم کے مطابق ''ادارہ دارالاسلام '' کا قیام عمل میں آیا اور ایک دستور العمل بھی تشکیل دیا گیا، دارالاسلام منصوبے کے قیام کے لیے مولانا مودودیؒ نے ترجمان القرآن میں مضامین لکھے اس کے اغراض ومقاصد بیان کیے۔ [15] یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک جاری رہا لیکن مولانا مودودیؒ اور ٹرسٹ کے درمیان طریق کار اور تصور دین کے بارے میں اختلاف پیدا ہوا [16] چنانچہ مارچ ۱۹۴۳ء کو دارالاسلام کو لاہور منتقل کردیا گیا پھر ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔

دارالاسلام علامہ اقبالؒ کا تخیل ، چوہدری نیاز علی خان کا ایثار اور مولانا مودودیؒ کے فکری اجتہاد کا ایک حسین امتزاج تھا۔دارالاسلام ایک مقام بھی تھا ایک تصور کی عملی تشکیل بھی اور جماعت اسلامی کا نخشت اول بھی ۔ [17]

مولانا مودودیؒ حیدرآباد کا آرام وسہولت تج کر ایک دور افتادہ بستی پٹھان کوٹ اور لاہور تک سفر فی الواقعہ ہجرت ہی سے تعبیر کیا جائے گا ۔مولانا مودودیؒ کے پیش نظر اس سفر کی

منزل بھی برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ کی اصلاح اور خدمت ہی تھی اس اعتبار سے یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک اور اس کے بعد ۱۹۴۱ء تک کا دور بالواسطہ یا بلاواسطہ تحریک پاکستان کی علمی وفکری جدوجہد سے عبارت ہے۔ اس دور کے اہم واقعات کی ہم الگ بھی نشان دہی کریں گے۔

☆ جماعت اسلامی کا قیام:

مولانا مودودیؒ نے جماعت اسلامی کے قیام کی وجوہات کو اپنی مختلف تحریروں اور تقریروں میں بیان کیا ہے ان کے پیش نظر جماعت اسلامی کے قیام کا بنیادی محرک ومقصد مسلمانان ہند کا مستقبل تھا، ہر ہر صورت میں کہ اگر مسلم لیگ قیام پاکستان کی کوشش میں ناکام ہوجائے اور انگریز اکثریت کی بنیاد پر حکومت ہندوؤں کے حوالے کردے، اور اگر مسلم لیگ کامیاب ہوجائے اور ملک تقسیم ہوجائے تو جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں ان کے لیے کیا کیا جائے اور جو ملک مسلمانوں کے قبضہ میں آئے گا اس کو مسلمانوں کی کافرانہ حکومت پنجے سے کیسے بچایا جائے اور اسے اسلامی حکومت کے راستے پر کیسے ڈالا جائے۔ یہی وہ امور تھے اور موقع تھا جب مولانا مودودیؒ نے جماعت اسلامی کے نام سے ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں جماعت اسلامی قائم کی گویا جماعت اسلامی کے قیام کی اصل غرض وغایت بھی اسلام، مسلمان اور پاکستان ہی تھے مولانا مودودیؒ کے پیش نظر یہ تھا کہ ایک ایسی منظم جماعت ہو جو تقسیم کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو سنبھالے اور جو پاکستان بن جانے کے بعد وہاں اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرے اور اگر ملک تقسیم نہ ہو تو مسلم لیگ کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی دوسری دفاعی لائن ثابت ہو سکے۔ [۱۸] اس اعتبار سے جماعت اسلامی کی تاسیس بھی فی الحقیقت تحریک پاکستان اور نظریہ پاکستان کے مقاصد کی عملی تعبیر تھی۔

☆تحریک پاکستان کی عملی حمایت:

مولانا مودودیؒ نے تحریک پاکستان میں جن فکری اور نظریاتی بنیادوں پر کردار ادا کیا اس نے یقیناً نہرو اور گاندھی کے متحدہ قومیت کا خواب چکنا چور کردیا بلکہ ایسی مضبوط اور مستحکم بنیادیں فراہم کردیں کہ مسلمانوں کو ہندوؤں یا ہندو قومیت کے اندر جذب کرنے کے تمام امکانات

ختم کردیے تاہم اب دوسرا مرحلہ تحریک پاکستان کی عملی جدوجہد اور حمایت کا تھا اس میں بھی مولانا مودودیؒ نے اسلام اور ملت اسلامیہ کے وسیع تر مفاد میں اپنے بعض تحفظات کے باوجود پاکستان کی حمایت کی۔

پاکستان کے بارے میں ریفرنڈم کا مرحلہ آیا تو صوبہ سرحد اور سہلٹ کے ریفرنڈم کے موقع پر مولانا مودودیؒ نے پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالنے کا مشورہ دیا اور لوگوں کو اس پر آمادہ کرنے کے لیے فرمایا:

"اگر میں صوبہ سرحد کا رہنے والا ہوتا تو استصواب رائے میں میرا ووٹ پاکستان کے حق میں پڑتا۔ اس لیے کہ جب ہندوستان کی تقسیم ہندو اور مسلم قومیت کی بنیاد پر ہو رہی ہے تو لامحالہ ہر اس علاقہ کو جہاں مسلمان قوم کی اکثریت ہو اس تقسیم میں مسلم قومیت ہی کے علاقے کے ساتھ شامل ہونا چاہیے"۔ [۱۹]

مولانا مودودیؒ کا یہ بیان نہ صرف قیام پاکستان کی حمایت میں ایک اہم حصہ ہے بلکہ ان عناصر کے اس پروپیگنڈے کا جواب بھی ہے جو مولانا مودودیؒ پر پاکستان کی مخالفت کا من گھڑت الزام عائد کرتے ہیں پاکستان سے تعلق کے حوالے سے مولانا مودودیؒ کی آخری تحریر" I am a Muslim and Pakistani" ہے۔ مولانا ان ہی دو نسبتوں، ایک مسلمان اور دوسرے پاکستانی ہونے پر فخر کرتے تھے۔

☆ مولانا مودودیؒ اور قائد اعظمؒ:

بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کے حوالے سے بھی مولانا مودودیؒ پر الزام تراشیاں کی گئیں ہمارے خیال میں یہ برمحل ہوگا کہ اس الزام کی حقیقت بھی بے نقاب کردی جائے۔

مولانا مودودیؒ ایک اصولی انسان تھے وہ جس چیز کو صحیح سمجھتے اور سمجھتے تھے اسے بیان کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے تھے، تحریک پاکستان میں جو لوگ شامل تھے ان کے بارے میں مولانا نے برملا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ:

جس قسم کے عناصر پاکستان کی تحریک میں شامل ہو رہے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے میں

یقینی طور پر یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ عناصر جمع ہو کر ایک ملک بنا سکتے ہیں ایک قومی حکومت قائم کر سکتے ہیں، لیکن ان عناصر سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ یہ ایک اسلامی حکومت بنا لیں گے۔ میں اس کو بالکل صاف دیکھ رہا تھا، مسئلہ ایک شخص کا یا چند اشخاص کا نہیں ہے مسئلہ یہ ہے کہ اس تحریک میں جو لوگ شامل ہو رہے تھے جو اس میں پیش پیش تھے جو اس تحریک کو چلا رہے تھے ان کے کیریکٹر کو دیکھتے ہوئے، ان کی زندگیوں کو دیکھتے ہوئے ان کی تعلیم، ان کے خیالات اور ان کی ہر چیز کو دیکھتے ہوئے ان سے کیا توقعات وابستہ کی جا سکتی تھیں۔ میں یہ اندازہ کر رہا تھا کہ یہ ایک ملک بنا سکتے ہیں لیکن اس کو اسلامی حکومت نہیں بنا سکتے"۔۳۹ ایک اور مقام پر مولانا یہ فرمایا کہ

"ہم نے محسوس کیا کہ پاکستان بنانے والوں کا ارادہ ہرگز یہاں ایک اسلامی حکومت قائم کرنے کا نہیں ہے میں آپ سے پوچھتا ہوں اور ہر شخص خود غور کرے کہ اگر واقعی پاکستان کو اسلامی حکومت بنانے کا مقصد ان کے پیش نظر تھا تو کیا پہلا کام ان کو یہ نہ کرنا چاہیے تھا کہ دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد (Objective Resolation) پاس کرتے جس قرارداد کو ڈیڑھ دو سال کے سخت مطالبہ کے بعد پاس کیا گیا اس کو اول روز ہی پاس ہونا چاہیے تھا اگر واقعی اسلامی حکومت بنانا پیش نظر تھا"۔۴۰ مولانا مودودیؒ کا یہ اندازہ کچھ غلط نہ تھا اور بعد کے واقعات نے کیا ثابت نہیں کیا کہ پاکستان اسلامی مملکت بن سکا اور یہاں اسلامی حکومت قائم ہو سکی؟ لیکن مولانا کے رقیبوں نے ان اندازوں اور خیالات کو غلط معنی پہنانے کی کوشش کی جس پر مولانا نے فرمایا کہ:"میرے اس فقرے کو یہ معنی پہنانے کی کوشش کی گئی کہ بانیان پاکستان کا شروع ہی سے پاکستان کو ایک اسلامی حکومت بنانے کا ارادہ نہیں تھا پھر اس میں مزید شرارت سے یہ معنی بھی پیدا کر لیے گئے کہ دراصل میں نے اس فقرے میں قائد اعظم مرحوم پر حملہ کیا ہے حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں" مولانا اس کی وضاحت اور تصریح منیر انکوائری کمیٹی ۱۹۵۳ء میں کر چکے ہیں یہاں کمیٹی میں مولانا کے بیان سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

بے شمار شہادتیں اس امر کی موجود ہیں کہ پاکستان کے قیام سے پہلے قائد اعظم مرحوم مسلمانوں سے ایک اسلامی ریاست کا وعدہ کرتے رہے تھے اور اس کے بعد بھی اس کو دہراتے رہے ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایک تقریر میں انہوں نے فرمایا "مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں

جہاں وہ خود اپنے ضابطہ حیات اپنے تہذیبی ارتقاء، اپنی روایات اور اسلامی قانون کے مطابق حکمرانی کر سکیں"۔۴۱

اور خود قائد اعظم مولانا مودودیؒ کے بارے میں کیا احساسات رکھتے تھے اس کے راوی قمر الدین خان کی زبانی سنیے:

"موصوف نے لکھا کہ وہ مولانا مودودیؒ صاحب کے ایماء پر ۱۹۴۳ء میں قائد اعظم سے ملے اور راجہ آف محمود آباد کی مدد سے گل رعنا (دہلی) میں ہماری ملاقات کا انتظام کیا گیا قائد اعظم پینتالیس منٹ تک بڑے صبر سے میری بات سنتے رہے اور پھر کہا کہ مولانا مودودیؒ کی خدمات کو وہ نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد ریاست کا حصول ان کی زندگی اور کردار کی تعمیر سے زیادہ فوری اہمیت کا حامل ہے، انہوں نے کہا کہ جماعت اور مسلم لیگ میں کوئی اختلاف نہیں ہے جماعت اگر ایک اعلیٰ مقصد کے لیے کام کر رہی ہے تو لیگ اس فوری حل طلب مسئلے کی طرف متوجہ ہے جسے اگر حل نہ کیا جا سکا تو جماعت کا کام مکمل نہ ہو سکے گا"۔۴۲

یہ تھی تحریک پاکستان اور بانی پاکستان کے بارے میں مولانا مودودیؒ کی اصل پوزیشن مولانا کی اس پوزیشن کو طالع آزماؤں نے اپنے گروہی اور سیاسی مقاصد کے لیے مسخ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی اگرچہ وقتی طور پر مولانا کے خلاف دھول اڑا کر اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن اوراق تاریخ کو مسخ نہ کر سکے۔ ان حقائق کی روشنی میں قیام پاکستان سے قبل تحریک پاکستان میں مولانا مودودیؒ کے نظریاتی و سیاسی کردار کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قیام پاکستان سے قبل مولانا مودودیؒ کے سیاسی نظریاتی کردار اور خدمات کا جائزہ لینے کے بعد قیام پاکستان کے وقت یعنی قیام پاکستان کے فوراً بعد مولانا مودودیؒ کے پاکستان کے بارے میں تصورات و خیالات اور خدمات کیا تھیں، ان کا جائزہ لیں گے۔

☆ مہاجرین کی خبر گیری اور بحالی:

مولانا مودودیؒ کے افکار ہی میں نہیں بلکہ ان کے دل میں بھی مسلمانوں سے محبت

اور ہمدردی کے جذبات موجزن رہے وہ ملت اسلامیہ کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے تھے۔اس کی متعدد مثالیں ان کی زندگی میں ملتی ہیں لیکن یہاں پاکستان کے حوالے سے صرف مہاجرین پاکستان کے لیے مولانا مودودیؒ کے محسوسات اور خدمات کا جائزہ لیں گے۔

ہندوستان کی تقسیم کے آثار جوں جوں نمایاں ہوتے جارہے تھے ہندوؤں اور سکھوں کی مسلمانوں کے خلاف قتل وغارت گری لوٹ مار اور پرتشدد سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں بہار میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو اپنے انتقام کا نشانہ بنایا، ان پر مسلح حملے کیے اور جلاؤ گھیراؤ کرکے پوری کی پوری آبادیوں کو اجاڑ ڈالا ان بلوؤں میں بہار کے ہزاروں مسلمان شہید اور زخمی ہوئے اور جو بچ گئے انہیں گھروں سے بے دخل کردیا اس موقع پر مولانا مودودیؒ نے پٹنہ میں مسلمان مہاجرین کی امداد کے لیے کیمپ قائم کیا ان کی حفاظت کا بندوبست کیا۔ ۴۴

i۔ تقسیم کے بعد مولانا مودودیؒ اس وقت تک پٹھان کوٹ سے لاہور نہیں آئے جب تک انہیں اس بات کی ضمانت نہ دیدی گئی کہ کیمپوں میں پناہ گزیں محفوظ ہیں حالانکہ مولانا خود،ان کے اہل خانہ اور رفقائے جماعت کو بلوائیوں سے جان ومال کا خطرہ تھا۔

ii۔ مولانا مودودیؒ خود جاگ کر ساری ساری رات پہرہ دیتے جب حالات انتہائی خراب ہوگئے تو اعلیٰ پولیس افسران نے مولانا مودودیؒ کو بتایا کہ یہاں حملے کا شدید خطرہ ہے ہم آپ کو بحفاظت نکالنے کے لیے آئے ہیں تو مولانا مودودیؒ نے جانے سے انکار کردیا اور کہا کہ میں اتنے لوگوں کو کیمپ میں چھوڑ کر اکیلا کیسے جاسکتا ہوں کیونکہ انہیں سنبھالنا اور ضروری سہولتیں پہنچانا میری ذمہ داری ہے یہاں تک کہ جب پاکستانی فوج نے ان کیمپوں کا چارج لے لیا اور مولانا مودودیؒ مطمئن ہوئے تو ایک قافلے کے ساتھ ہجرت کرکے پاکستان آگئے۔ ۴۵

iii۔ کوال منڈی کیمپ میں قیام کیا اور واہگہ سے لے کر شاہدرہ اور والٹن تک لٹے ہوئے مہاجروں کی امداد وبحالی کے لیے کیمپ قائم کیے ان کیمپوں میں کام کرنے والوں میں جماعت کے رفقاء کی ایک بڑی تعداد تھی جو خود بھی مہاجر تھے لیکن انہوں نے مولانا مودودیؒ کی اپیل پر اپنے مسائل ومشکلات سے بے نیاز ہوکر مہاجروں کی خدمت کی شیخ فقیر حسین جو مولانا کے ابتدائی ساتھیوں میں سے تھے ان کیمپوں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ

میلوں چل کر بھوک وپیاس کے مارے خستہ حال مہاجرین پاکستان میں داخل ہوتے تو نڈھال ہوکر گر پڑتے ہم انہیں لیموں کی سکنجبین پیش کرتے .....عوام نے اس سلسلے میں ہم سے بہت تعاون کیا ،وزیر اعظم خان لیاقت علی خان نے ہمارے کیمپ کا دورہ کیا .....کیمپ میں پارچات کی تقسیم کے علاوہ کیمپ کی صفائی ہمدردوں کی تجہیز وتکفین سے لے کر تدفین تک ہم خود کرتے۔ ۴۶

مولانا مودودیؒ نے مصیبت زدہ مہاجرین کی مدد کرکے فی الحقیقت انصار مدینہ کی مثال قائم کی، مصیبت زدہ افراد کی مدد کے اس اصول کو مولانا نے اپنی جماعت کی ایک مستقل پالیسی بنایا اور خدمت خلق کے نام سے ایک مستقل شعبہ قائم کیا،سیاست میں انسانیت کی خدمت کا یہ تصور پاکستان میں متعارف کرنے کا سہرا مولانا مودودیؒ اور ان کی جماعت کے سر ہے۔ خدمت خلق کے شعبہ کے تحت قربانی کی کھالوں سے جمع ہونے والی رقم غریبوں، یتیموں اور ناداروں پر خرچ کی جاتی۔اس رقم سے سستے اور مفت شفاخانے اور دینی تعلیم کے مدارس قائم کیے گئے۔اس حوالے سے ایک اور اہم بات یہ ہے کہ آمدن وخرچ کا ہر سال آڈٹ کرایا جاتا ہے اور اس کا گوشوارہ عوام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

جہاد کشمیر:

۳جون ۱۹۴۷ء کو وائسرائے ہندوستان لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ہند کے جس فارمولے کا اعلان کیا تھا اس کے مطابق ''برصغیر کی تمام دیسی ریاستوں کو آزاد رہنے پاکستان یا ہندوستان میں شمولیت اختیار کرنے کا حق ہوگا''۔ ۴۷

ریاست جموں وکشمیر کی تاریخ وثقافت ،جغرافیہ ،مذہبی ومعاشرتی اقدار وروایات اور تقسیم ہند کے اصول کے مطابق کشمیر کو پاکستان کا حصہ ہونا چاہیے تھا۔لیکن کشمیر کے اسی فیصد مسلمانوں کو دھوکا دیا گیا تقسیم ہند سے تقریباً ڈیڑھ برس قبل انگریزوں نے کشمیر، راجہ گلاب سنگھ کو فروخت کردیا تقسیم کے بعد مہاراجہ ہری سنگھ (گلاب سنگھ کا پڑپوتا) نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں عوام کی آراء جانے بغیر ریاست کا بھارت سے الحاق کرلیا اسی کے ساتھ بھارتی فوجیں سری نگر میں اتریں اور انہوں نے انتظامیہ اور ہندو انتہاپسندوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا قتل عام شروع کردیا

۔ اس کے بعد پاکستانی فوجیں بھی کشمیر میں داخل ہوگئیں ، بھارتی وزیر اعظم جنگ بندی کی درخواست لے کر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پہنچ گئے وزیر اعظم پاکستان کو یقین دلایا کہ ہمارا وعدہ ہے کہ امن وامان بحال ہونے پر ہم اپنی فوجیں واپس بلالیں گے اور ریاست کے مستقبل کا فیصلہ ریاست کے عوام پر چھوڑ دیں گے یہ وعدہ صرف آپ کی حکومت سے ہی نہیں کشمیر کے عوام اور پوری دنیا کے ساتھ ہے ۔نہرو کی درخواست پر اقوام متحدہ نے کشمیر کے مسئلہ کے حل کے لیے استصواب رائے کی قراردادیں پاس کیں اور ریفرینڈم کے لیے اقوام متحدہ کے ناظم استصواب بھی مقرر کیے گئے لیکن بھارت نے یہ کام نہیں کیا۔۲۵ تازہ کشمیر کی اس مختصر تاریخ کے بعد اب ہم مولانا مودودیؒ کی کشمیر سے تعلق واہمیت کا جائزہ لیں گے ۔مولانا خود کشمیر سے اپنے تعلق کا یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

''میں ۲۹ اگست ۱۹۴۷ء کو لاہور پہنچا اور دوسرے ہی دن صبح وزیر اعلیٰ پنجاب افتخار حسین ممدوٹ سے ملا اور میں نے ان سے کہا کہ ریڈکلف ایوارڈ ہندوستان کے لیے کشمیر کا راستہ کھول رہا ہے اس معاملے کی اتنی اہمیت میری نگاہ میں تھی کہ میں نے چند گھنٹے بھی ضائع کرنے مناسب نہیں سمجھے ۔ رانا اللہ داد خان صاحب کو بھیج کر خود وقت طے کروایا ۔ جب ریڈکلف ایوارڈ کا اعلان ہوا تو میں نے اسوقت اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کشمیر ہاتھ سے گیا ۔ چنانچہ میں نے یہاں پہنچتے ہی نواب ممدوٹ صاحب سے کہا کہ گورداسپور اس لیے ہندوستان کو دیا گیا کہ وہ کشمیر پر قابض ہوسکے میں نے نواب صاحب سے یہ بھی کہا کہ پنجاب میں لاکھوں سابق لازمی فوج موجود ہیں ان کو منظم کرکے جلدی سے جلدی کشمیر پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ۔ان کو اسلحہ کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ کچھ نہ کچھ اسلحہ ان کے پاس موجود ہے ۔ مہاراجہ کشمیر سے سٹینڈسٹل معاہدہ نہ کیا جائے۔اس کے بعد اگلے ہی روز میں چودھری محمد علی صاحب سے بھی ملا اور یہی بات ان سے بھی کہی میں نے ان سے کہا میری یہ بات لیاقت علی خان صاحب تک پہنچادیں کہ وہ فی الفور کشمیر کی فکر کریں''۔۲۶

مذکورہ بالا واقعہ سے مولانا مودودیؒ کی کشمیر کے بارے میں خلوص ،سنجیدگی اور فکر مندی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تاہم بعض عناصر نے مولانا مودودیؒ سے بغض وعناد میں اور ان کی

شہرت اور سیاسی ساکھ کو پاکستانیوں کی نظر میں مجروح کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ مولانا مودودیؒ کشمیر کے جہاد کو حرام قرار دیتے ہیں اس الزام کی کیا حقیقت ہے؟

پہلے اس الزام کا جواب پھر کشمیر کے بارے میں مولانا کا متعین موقف ملاحظہ فرمائیں۔

''مولانا مودودیؒ اب تک جنگ کشمیر میں پاکستان کے شہریوں کے عملاً حصہ لینے کے حامی تھے۔لیکن اس معاہدے کے بعد ان کی رائے بدل گئی اور ان کا موقف یہ ہوگیا کہ ہماری نمائندہ حکومت کے ہندوستان کی حکومت کے ساتھ جو معاہدانہ تعلقات ہیں ان کی موجودگی میں پاکستان کے شہریوں کے لیے کشمیر کی جنگ میں عملاً شریک ہونا شرعاً جائز نہیں رہا۔۲۷

مولانا نے اس الزام کا جواب دیتے ہوئے مزید کہا کہ :

''یہ بات میں نے کبھی نہیں کہی ۔جو کچھ میں نے کہا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ جب تک حکومت پاکستان نے حکومت ہند کے ساتھ معاہدانہ تعلقات قائم کررکھے ہیں پاکستانیوں کے لیے کشمیر میں ہندوستانی فوجوں سے لڑنا از روئے شرع جائز نہیں ہے میرے اس قول کو لے کر ایک منطقی ہیرپھیر کے ذریعے سے یہ نتیجہ نکال لیا گیا کہ جب ایسا کرنا جائز نہیں ہے تو جو لوگ وہاں لڑکر مارے جاتے ہیں وہ ضرور حرام موت مرتے ہیں اور جہنمی ہیں ۔ پھر اپنے نکالے ہوئے اس نتیجے کو زبردستی مجھ پر تھوپ دیا گیا۔ یہ تکفیر بازوں کا پرانہ حربہ ہے کہ کسی شخص کی کہی ہوئی اصل بات پر اگر لوگوں کو اشتعال نہ دلایا جاسکے تو اس سے ایک دوسری بات خود نکال کر اس کی طرف منسوب کردی جائے''۔۲۸

مولانا نے کشمیر کے بارے میں ہونے والے فتنے کی اصل نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا:

''کشمیر کے معاملے میں جو الجھنیں واقع ہوئی ہیں وہ سب ہمارے لیڈروں کی پیہم غلطیوں کے نتائج ہیں انہوں نے ریاستوں کے بارے میں ایک مبہم بات مان لی اور قطعی طور پر یہ طے نہیں کرایا کہ کسی ملک میں کسی ریاست کی شرکت کا فیصلہ والی ریاست نہیں کرے گا بلکہ باشندگان ریاست کریں گے ۔بلکہ وہ ہمارے ہی لیڈر تھے جنہوں نے اس خیال کی مخالفت کی

پھر انہوں نے سرحدوں کے تعین کا فیصلہ ریڈکلف اور ماؤنٹ بیٹن کے ہاتھ میں چھوڑ دیا اور پیشگی لکھ کر دے دیا کہ جو سرحدی خط وہ کھینچ دیں گے اس کو یہ بے چون وچرا مان لیں گے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورداسپور کا ضلع انڈین یونین میں شامل کر دیا گیا اور کشمیر کے ہندو مہیس کو ہندوستان میں شامل ہو جانے کا راستہ مل گیا پھر انہوں نے ریاست کشمیر کے ساتھ بھی تعلقات کا معاہدہ کر لیا اور جموں اور پونچھ میں جب مسلمانوں پر ظلم وستم ہو رہے تھے یہ خاموش بیٹھے دیکھتے رہے پھر جب والی کشمیر انڈین یونین میں شامل ہو گیا اور ہندوستان نے وہاں فوجیں اتار دیں تو بیانات دینے کے سوا کچھ نہیں کیا۔[۳۲]

اگست ۱۹۴۸ء میں مولانا مودودیؒ کے خلاف حکومت پاکستان اور انڈیا ریڈیو کے ذریعے سے مجاہدین کشمیر اور کشمیریوں کو گمراہ کرنے کی جو پروپیگنڈہ مہم شروع کی تھی اس کا تفصیلی جواب مولانا نے ایک بیان کی صورت میں دیا اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

☆ "میں کشمیر کو پاکستان کا ایک قدرتی حصہ سمجھتا ہوں میرے نزدیک جغرافیائی، نسلی، تاریخی، معاشی، تمدنی ہر لحاظ سے کشمیر پاکستان سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ ہندوستان سے"۔

☆ ریاست کشمیر کے مسلمان ڈوگروں اور ہندوستانی فوجوں کے مقابلے میں اپنی جان و مال اور آزادی بچانے کی جو جدوجہد کر رہے ہیں میں اسے بالکل حق بجانب سمجھتا ہوں اور متعدد بار کہہ چکا ہوں کہ ان کی یہ جنگ اسلامی نقطہ نظر سے جہاد کے حکم میں ہے۔

☆ پاکستان کے باشندوں کے لیے بھی شرعاً بالکل جائز سمجھتا ہوں کہ وہ کشمیر کی جنگ آزادی میں خوراک، پوشاک اور طبی امداد کی حد تک حصہ لیں اگر مجاہدین کشمیر ان سے اسلحہ خریدیں تو وہ فروخت کرنے کے بھی شرعاً مجاز ہیں لیکن جب تک حکومت ہند اور حکومت پاکستان کے درمیان معاہدانہ تعلقات قائم ہیں میں براہ راست جنگی کاروائی میں ان کی شرکت کو جائز نہیں سمجھتا..... لیکن میری رائے کا ہرگز یہ منشاء نہیں ہے کہ حکومت پاکستان، حکومت ہند کے ساتھ ان معاہدانہ تعلقات کو باقی رکھے اور پاکستان کے لوگ کشمیر کی جنگ آزادی میں شرکت سے باز رہیں اس کے برعکس میرا اصل منشاء یہ ہے کہ حکومت پاکستان ان تعلقات کو ختم کر کے ہمارے راستے سے وہ اخلاقی اور شرعی رکاوٹیں دور کر دے جو میرے نزدیک ہمیں کشمیر کے لیے

اپنی پوری طاقت صرف کرنے سے روک رہی ہے۔ میں کشمیر کو پاکستان کی زندگی کے لیے ناگزیر سمجھتا ہوں۔[۳۳]

کشمیر، قیام پاکستان کے بعد سب سے اہم اور حساس مسئلہ تھا مولانا مودودیؒ نے اس مسئلے پر جو ذمہ دارانہ کردار ادا کیا وہ ان کی سیاسی نظریاتی بصیرت کے شایان شان تھا۔ کشمیر پر مولانا مودودیؒ کا یہ اصولی موقف پاکستان کی خارجہ پالیسی کا مستقل اصول بن گیا مولانا نے فی الحقیقت کشمیر پر آواز بلند کر کے ہندوستان کے خاصانہ عزائم کو ناکام اور کشمیریوں کی آزادی کو نئی روح اور جہت عطا کی۔ کشمیر کے بارے میں یہی موقف قائد اعظم کا بھی تھا وہ زندگی کی آخری سانس تک کشمیر کے بارے میں فکرمند رہے۔

ہم مقالے کے آخر میں قیام پاکستان کے بعد مولانا مودودیؒ کے سیاسی اصول نظریات اور خدمات کا جائزہ لیں گے تاہم اس سے قبل بعض مسلمہ سیاسی اصطلاحات وتصورات جیسے ریاست، سیاست، جمہوریت دستور، انتخابات، خارجہ تعلقات اور بنیادی حقوق کے بارے میں اختصار کے ساتھ مولانا کے افکار کا تذکرہ کریں گے یہ اس لیے ضروری ہے کہ پاکستان کے سیاسی حالات اور واقعات کے تناظر میں مولانا کی فکر اور ان کی خدمات کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔

☆ نظریہ ریاست:

مولانا مودودیؒ ریاست کے وجوب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

" اجتماعی زندگی کے نظم کو قائم کرنے کے لیے بہرحال ایک قوت قاہرہ (Coercive Power) کی ضرورت ہے جسے "اسٹیٹ" یا ریاست کہتے ہیں اس ضرورت کا انکار انارکی پر اعتقاد رکھنے والوں کے سوا آج تک کسی نے نہیں کیا ہے یا پھر اشتراکی تصوف میں ایک ایسے مقام کا تصور کیا گیا ہے جہاں پہنچ کر انسان کی حیات اجتماعی ریاست کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائے گی لیکن یہ صرف عالم خیال کی باتیں ہیں جن کی تائید میں کوئی تجربہ یا مشاہدہ پیش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ عملی زندگی کا تجربہ اور انسانی فطرت کا علم یہی بتاتا ہے کہ تمدن کا قیام ایک قوت قاہرہ کا یقیناً محتاج ہے ..... پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ قوت جو اپنے قہر وغلبہ سے نظام تمدن کو قائم رکھتی ہے۔ بجائے خود کسی نہ کسی نظریہ اور کسی نہ کسی اجتماعی مسلک کی قائل ہوتی

ہے اسی نظریہ و مسلک کے مطابق وہ اپنے لیے ایک لائحہ عمل بناتی ہے اسی لائحہ عمل کو وہ قاہرانہ طاقت کے ساتھ اجتماعی زندگی میں نافذ کرتی ہے اور تمدنی شکل کے بننے اور بگڑنے میں اس قہر کی نوعیت اور اس لائحہ عمل کی اصولی تصویر کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ صرف اجتماعی زندگی ہی نہیں بلکہ انفرادی زندگی بھی بڑی حد تک خواہ مخواہ اسی سانچے میں ڈھل کر رہتی ہے جسے اسٹیٹ اپنے قہر و تسلط سے بنا دیتا ہے جو لوگ کسی ریاست کے دائرے میں رہتے ہوں وہ چاہے اس کے بنیادی نظریے اور اس کے تفصیلی لائحہ عمل پر ایمان نہ رکھتے ہوں اور کسی طرح پر راضی نہ ہوں لیکن انہیں چار و ناچار اپنے عقیدہ و مسلک کے 90فیصدی حصہ سے دستبردار ہو کر ریاست کے عقیدہ و مسلک پر چلنا پڑتا ہے باقی 10فیصدی میں بھی ان کے عقیدے و مسلک کی گرفت روز بروز ڈھیلی ہوتی چلی جاتی ہے .... (اس اعتبار سے) اجتماعی زندگی کے لیے ریاست بہر حال ناگزیر ہے۔۴۴ع

☆ تصورِ حکومت:

اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے وہ صرف وعظ و تذکیر سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لیے سیاسی طاقت بھی درکار ہے .... اقامت دین اور نفاذ شریعت اور اجراء حدود اللہ کے لیے حکومت چاہنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب و مندوب ہے اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اسے دنیا پرستی یا دنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مولانا اپنے سیاسی نظریات کی تائید میں قرآن و سنت اور اجماع صحابہ سے دلیل پیش کرتے ہیں تصور حکومت سے متعلق مولانا قرآن کی سورہ بنی اسرئیل کی آیت ۸۰ کا حوالہ دیتے ہیں:

''اور دعا کرو پروردگار مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے''۔ ۴۵ع

وہ حکومت کی تائید میں یہ حدیث بھی پیش کرتے ہیں مفسرین قرآن نے مذکورہ آیت کی تائید میں پیش کی ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سد باب کر دیتا ہے جن کا سد باب قرآن سے نہیں کرتا''۔

گویا حکومت و اقتدار کی طاقت معاشرتی بگاڑ، فواحش و معاصی کو روکنے کا اللہ کے قانون عدل کے نفاذ کا ذریعہ ہے۔ ۴۶ع

☆ تفریق دین و سیاست:

مولانا مودودیؒ نے دین و سیاست کی تفریق کو یکسر مسترد کیا ہے ان کے نزدیک اس کی دلیل اسلامی و قرآنی بھی ہے اور نفسیاتی اور تاریخی بھی ہے اس ضمن میں مولانا مودودیؒ نے ایک بنیادی اصول کی نشاندہی کی ہے وہ کہتے ہیں کہ:

''اسلام خود اپنا ایک نظام زندگی رکھتا ہے جس میں عقائد، اخلاق، عبادات کے ساتھ انفرادی عمل اور اجتماعی زندگی کے تمام معاملات سے متعلق احکام و قوانین بھی ہیں''۔ ۴۷ع

اس اصول کی روشنی میں سیاست، جو اجتماعیت کا موضوع ہے یقینی طور پر اس کا تعلق دین سے ہے اور سیاست یا اجتماعیت کو دین سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ دین و سیاست میں تفریق کی کمی بتاتے ہوئے مولانا کہتے ہیں کہ:

''مسلمان جب اپنے اصل مقصد کو بھول کر اور اپنے حقیقی مشن کو چھوڑ کر دنیا پرستی میں مبتلا ہو گئے اور دینداری کے معنی ان کی نگاہ میں صرف یہ رہ گئے کہ عبادات اور معاشرت میں چند شرعی طور طریقوں کی پابندی کی جاتی رہے خواہ مقصد زندگی وہی ہوں جو دنیا پرستوں کے ہوتے ہیں، خواہ نظام اجتماعی کی زمام کار صالحین کے ہاتھ میں ہو یا فجار کے ہاتھ میں، اور خواہ اجتماعی امامت اپنے اصول اور نصب العین کے اعتبار سے اسلامی ہو یا غیر اسلامی تو اس غفلت کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں اس شکل میں دی گئی کہ ان کی بڑی بڑی آبادیاں پے در پے کفار کے تابع ہوتی چلی گئیں۔ ۴۸ع مزید فرماتے ہیں کہ:

''جو لوگ دین کو ایک معقول اور متناسب نظام فکر کی حیثیت سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کو منتشر اور اسے ایک دوسرے سے بے تعلق اجزاء کا مجموعہ سمجھتے ہیں ان کے لیے تو یہ بہت آسان ہے کہ انبیاء کے حالات زندگی، قرآن کی تعلیمات اور دین کے احکام و اوامر کو ٹکڑے کر کے ہر ایک کی ایسی تاویلیں اور تفسیریں کریں جن سے ایک جز دوسرے جز سے اور ایک پہلو دوسرے پہلو سے صریح تناقض کا رنگ اختیار کر لے .... لیکن اس دین کو ایک حکیم کے بنائے ہوئے

مرتب و مربوط اور متناسب نظام کی حیثیت سے دیکھنے والوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اس کے ہر پہلو اور ہر جز کی وہی تفسیر اور تاویل اختیار کریں جو کلی نظام کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہو"۔ ۳۹؎

مولانا نے اسلامی جمعیت طلبہ کی ایک تربیت گاہ میں ایک سوال کے جواب میں تفریق دین اور سیاست کے تصور کی بیخ کنی کرتے ہوئے فرمایا کہ :

"مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں ہیں لیکن جو چیز مدتوں سے ذہنوں میں جمی ہوئی ہے وہ بتدریج کے ساتھ ہی صاف ہوگی ہمارے نزدیک وہ سیاست لعنت ہے جو مذہب سے آزاد ہو اور وہ مذہب غیر مطلوب ہے جو انسانی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی سیاست کی اصلاح کیے بغیر چھوڑ دیتا ہے اسلام اس دوئی "دین اور سیاست" کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ ۴۰؎

☆ تصور جمہوریت :

مولانا مودودیؒ جمہوریت جمہوری عمل اور جمہوری اداروں پر اسطرح کامل یقین رکھتے تھے کہ انتظامیہ اور مقننہ کی تشکیل میں عام مسلمانوں کی رائے شامل ہونی چاہیے مگر ساتھ وہ کچھ حدود وقیود بھی عائد کرتے ہیں ان کے خیال میں "سارے انتظامی معاملات اور وہ تمام مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے، مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے اور الٰہی قانون جہاں تعبیر ہوگا وہاں کوئی مخصوص طبقہ یا نسل نہیں بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کی تعبیر کا مستحق ہوگا جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہنچائی ہو اس لحاظ سے یہ ڈیموکریسی ہے لیکن جہاں خدا اور رسول ﷺ کا حکم موجود ہو وہاں مسلمانوں کے کسی امیر کو کسی مقننہ کو کسی مجتہد اور عالم دین کو بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو مل کر بھی سرمو ترمیم کرنے کی حق حاصل نہیں"۔ ۴۱؎ مولانا نے جمہوریت پر جو یہ حدود وقیود عائد کی ہیں اس کی ایسی علمی اور عقلی توجیہ پیش کی جو خود انسان کے اپنے مفاد میں ہے۔ ۴۲؎ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مولانا کا تصور جمہوریت مغرب کے سیکولر (لادینی) تصور جمہوریت سے مختلف اور زیادہ پائیدار و منطقی ہے تاہم ان شرائط کے ساتھ مولانا نے جمہوریت کے مروجہ تصور کو قبول کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا ان کے نزدیک "جمہوریت اس چیز کا نام ہے کہ ایک ملک کے باشندے اپنے

ملک کے معاملات طے کرنے کے مختار ہوں اور ملک کے باشندوں کی جو رائے ہو ملک کا انتظام اس کے مطابق چلایا جائے یہ ہے جمہوریت کا مفہوم"۔ ۴۳؎ بادی النظر میں یہاں ایک قسم کا تناقض محسوس ہوتا ہے کہ ایک طرف تو جمہوریت پر شرائط عائد کی جارہی ہیں دوسری طرف جمہوریت کے مروجہ مفہوم کی تائید کی جارہی ہے، ہمارے نزدیک یہ تناقض نہیں ہے بلکہ جمہوریت، جو اسلامی اجتماعیت کا وصف ہے اس کی صحیح تعبیر وتشریح ہے اصل فرق یہ ہے کہ مولانا نے مغرب کی بے دین جمہوریت کے مقابلے میں اسلامی اجتماعیت کی روح پر مشتمل جمہوریت کا تصور پیش کیا ہے، مولانا نے ایک موقع پر اسلامی اور مغربی جمہوریت کے فرق کو انتہائی مختصر اور جامع الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا کہ :

"مغربی جمہوریت عوام کی حاکمیت پر قائم ہے اسلامی جمہوریت اس بات کا عہد کرتی ہے کہ وہ خدا اور رسول ﷺ سے سرمو انحراف نہیں کرے گی اس جمہوریت میں مشورے سے باہمی امور طے کیے جاتے ہیں اور عامۃ المسلمین جس کو کسی منصب پر چاہتے ہیں مشورے سے قائم کردیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں مشورے سے معزول کردیتے ہیں یہ اسلامی جمہوریت ہے مغربی اور اسلامی جمہوریت میں جو دوسرا فرق ہے وہ یہ ہے کہ مغربی جمہوریت کے پاس کلی اختیارات ہوتے ہیں کہ وہ جس چیز کو چاہے حرام قرار دے مثلاً شراب مغربی جمہوریت کے فیصلے سے جائز اور حلال ہوسکتی ہے لیکن اسلامی جمہوریت میں خدا نے شراب کو حرام کردیا ہے تو پوری قوم بھی مل کر حلال نہیں کرسکتی"۔ (تصریحات ص ۲۲۵)

مولانا مودودیؒ نے جمہوریت کا دفاع بھی کیا ہے اور اس پروپیگنڈے کی نفی بھی جو یہ کہتے ہیں پاکستان میں جمہوریت ناکام ہوگئی ہے، مولانا نے جمہوریت کی ناکامی کے پروپیگنڈے کا پاکستان میں دستوری خلا اور فوجی آمریت کے تاریخی تناظر میں تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ۴۴؎ اور اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ :

"جمہوریت کی ناکامی کے دعوے فقط ایک مکاری ہے جو ایک ملک کے باشندوں کے حقوق پر ڈاکہ مارنے کے لیے کی جاتی ہے"۔ ۴۵؎

مولانا جمہوریت کے ارتقاء وتسلسل کے لیے انتخابی عمل کے جاری رہنے کی ضرورت

اور بنیادی انسانی حقوق کی آزادی وتحفظ بالخصوص ذرائع ابلاغ جو فی الواقع رائے عامہ کی ذہن سازی کا ذریعہ ہیں کی آزادی پر زور دیتے ہیں مولانا کا کہنا ہے کہ:

"جس طرح قومی خوشحالی کے لیے دو یا تین پنج سالہ منصوبوں کی تکمیل کی شرط ہوتی ہے اسی طرح اگر جمہوریت کی کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے ایک قوم کو دو تین آزادانہ انتخابات کے مراحل سے گزرنا پڑے تو اس میں کیا حرج ہے اور اگر فرض کیجیے اس دوران میں ملک کے حالات خراب بھی ہو جائیں تو ملک کے کسی ملازم کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ یکایک ملک پر قابض ہو جائے۔ نوکر ہے تو نوکری کرے ملک کا مالک بننے کا اسے کیا حق حاصل ہے"[۴۷]

مولانا کے تصور جمہوریت کی دوسری توجیح یہ پیش کی جاسکتی ہے وہ شخصی یا فوجی آمریت پر کسی سمجھوتے کے قائل نہیں ہیں اور امر واقع ہے کہ انہوں نے فوجی آمریت کو نہ صرف قبول نہیں کیا بلکہ اس کے خلاف عملاً جدوجہد بھی کی ہے۔

☆ انتخابات

مولانا مودودیؒ کے سیاسی افکار کی ایک نمایاں ترین خصوصیت حقائق کا شعور اور ادراک ہے وہ زمینی حقائق سے یکسر منہ موڑ کر غیر فطری اور غیر لچکدار رویہ اختیار نہیں کرتے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے سیاسی افکار میں مثالیت کے ساتھ عملیت پسندی بھی بدرجہ اتم موجود ہے چنانچہ پاکستان کے سیاسی نظام کی تبدیلی کا طریقہ آئینی و دستوری طور پر انتخابات ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ ملک کا انتخابی نظام کن کن کثافتوں سے آلودہ ہے لیکن مولانا مودودیؒ اسی آئینی اور دستوری ڈھانچے میں رہتے ہوئے انتخابات کو ایک حقیقت تسلیم کرتے ہیں۔

چنانچہ انتخابات اور اس کے نقائص اور اس کی اصلاح کے بارے میں فرماتے ہیں کہ" اس وقت ہم جس مقام پر کھڑے ہیں اسی مقام سے ہمیں آگے چلنا ہوگا اور جس منزل تک ہم جانا چاہتے ہیں" اس کو واضح طور پر نگاہ کے سامنے رکھنا ہوگا تاکہ ہمارا ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھے۔ خواہ ہم پسند کریں یا نہ کریں، نقطہ آغاز تو لامحالہ یہی انتخابات ہوں گے کیونکہ ہمارے ہاں اسی طریقے سے نظام حکومت تبدیل ہو سکتا ہے اور حکمرانوں کو بھی بدلا جا سکتا ہے کوئی دوسرا ذریعہ اس وقت ایسا موجود نہیں ہے۔ جس سے ہم پر امن طریقے سے نظام حکومت بدل سکیں اور

حکومت چلانے والوں کا انتخاب کر سکیں اب ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہمارے ہاں انتخابات میں دھونس، دھوکے، دھاندلی، علاقائی یا مذہبی یا برادری کے تعصبات جھوٹے پروپیگنڈے، گندگی اچھالنے ضمیر خریدنے، جعلی ووٹ بھگتانے اور بے ایمانی سے انتخابی نتائج بدلنے کے غلط طریقے استعمال نہ ہو سکیں۔ انتخابات دیانتدارانہ ہوں، لوگوں کو اپنی آزاد مرضی سے اپنے نمائندے منتخب کرنے کا موقع دیا جائے پارٹیاں اور اشخاص جو بھی انتخابات میں کھڑے ہوں وہ معقول طریقے سے لوگوں کے سامنے اپنے اصول مقاصد اور پروگرام پیش کریں اور یہ بات ان کی رائے پر چھوڑ دیں کہ وہ کسے پسند کرتے ہیں۔[۷۵]

☆ بنیادی حقوق:

مولانا مودودیؒ نے بنیادی انسانی حقوق کے ارتقاء کی تاریخ پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے انہوں نے انگلستان کے میگنا کارٹا (۱۲۱۵ء) ٹام پین (Tam Paine) کے پمفلٹ "حقوق انسانی" فرانس کے "منشور حقوق انسانی" امریکا کے "دس نکاتی منشور حقوق انسانی" اور اقوام متحدہ کے "عالمی منشور حقوق انسانی" کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا:

اول تو مغربی دنیا میں انسانی حقوق کا تصور دو تین صدیوں سے پہلے اپنی کوئی تاریخ نہیں رکھتا ہے دوسرے اگر آج ان حقوق کا ذکر کیا بھی جارہا ہے تو ان کے پیچھے کوئی (Authority) اور کوئی قوت نافذہ (Sanction) نہیں ہے بلکہ یہ صرف خوشنما خواہشات ہیں۔[۷۶]

مولانا نے مغرب کے تصور حقوق انسانی کا موازنہ اسلام کے حقوق انسانی سے کیا اور فرمایا کہ "اسلام نے حقوق انسانی کا جو منشور قرآن میں دیا اور جس کا خلاصہ حضور نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر نشر فرمایا وہ اس سے قدیم تر بھی ہے اور ملت اسلامیہ کے لیے اعتقاد اخلاق اور مذہب کی حیثیت سے واجب الاتباع بھی۔[۷۷]

یہاں موقع نہیں ہے کہ مولانا نے قرآن اور اسلام کی رو سے انسانوں کو جو حقوق دیے ہیں ان کا تفصیلی ذکر کیا جائے تاہم عصری دنیا میں جن انسانی حقوق کا چرچا کیا جاتا ہے مولانا مودودیؒ نے اس کی سند اور قوت نافذہ کو اسلام کی روشنی میں پیش کیا ہے جو درج ذیل ہیں:

(۱) حرمت جان یا جینے کا حق (۲) معذوروں اور کمزوروں کا تحفظ
(۳) تحفظ ناموس خواتین (۴) معاشی تحفظ
(۵) عدل وانصاف (۶) نیکی میں تعاون اور بدی میں عدم تعاون
(۷) مساوات کا حق (۸) معصیت سے اجتناب
(۹) ظالم کی اطاعت سے انکار کا حق (۱۰) سیاسی کارفرمائی میں شرکت کا حق
(۱۱) آزادی کا تحفظ (۱۲) تحفظ طفلیت
(۱۳) عزت کا تحفظ (۱۴) نجی زندگی کا تحفظ
(۱۵) ظلم کے خلاف احتجاج کا حق (۱۶) آزادی اظہار رائے
(۱۷) ضمیر واعتقاد کی آزادی کا حق (۱۸) مذہبی دلازاری سے تحفظ کا حق
(۱۹) آزادی اجتماع کا حق (۲۰) عمل غیر کی ذمہ داری سے بریت
(۲۱) شہادت پر کاروائی اجتناب (۲۲) غیر مسلموں کے حقوق

ان عنوانات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام میں حقوق انسانی کا تصور کس قدر جامع ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اسلامی تصور حقوق انسانی کے امتیاز و انفرادیت کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ:

''وہ بنیادی حقوق جو اسلام نے انسانوں کو عطا کیے ہیں ان کا تصور بالکل واضح اور مکمل ہے جو انسانی زندگے کے آغاز ہی سے انسان کو بتا دیے گیے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس وقت بھی دنیا میں انسانی حقوق کا جو اعلان (Declaration of Human Rights) ہوتا ہے اسے کسی قسم کی سند اور قوت نافذہ حاصل نہیں ہے بس ایک بلند معیار پیش کر دیا گیا ہے اس معیار کی عملدرآمد کی کوئی قوم پابند نہیں ہے نہ اور کوئی ایسا موثر معاہدہ ہے جو ان حقوق کو ساری قوموں سے منوا سکے لیکن مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایت کے پابند ہیں۔ خدا اور رسول ﷺ نے بنیادی حقوق کی پوری وضاحت کر دی جو مملکت اسلامی ریاست بنا چاہے گی اسے یہ حقوق لازماً دیے جائیں گے اور دوسری اقوام کو بھی۔'' ۵۰

☆ دفاع اور جنگ وسلح کی پالیسی:

مولانا مودودیؒ نے عصری سیاسی امور ومسائل میں دفاع اور جنگ وسلح کے بارے میں بھی واضح موقف پیش کیا ہے اور یہ موقف بھی قرآن کریم اور احادیث نبوی ﷺ کی روشنی میں پیش کیا ہے مولانا فرماتے ہیں کہ:

''اسلامی حکومت کی پالیسی کی ایک بنیاد یہ بھی ہے کہ وہ ہر اعتبار سے مضبوط ہو عسکری اعتبار سے بھی اور معاشی اعتبار سے بھی جو عظیم ذمہ داری اسے ادا کرنی ہے وہ دفاعی قوت کی بنیاد کے بغیر ادا نہیں کی جاسکتی ہے..... اس ضمن میں وہ سورہ انفال آیت ۶۰ اور سورہ المائدہ آیت ۳۳ اور التوبہ آیت ۲۹ سے استدلال کرتے ہیں''۔ ۵۱

☆ خارجہ پالیسی:

مولانا مودودیؒ نے خارجہ پالیسی کا جو عصری سیاست کا ایک اہم ترین شعبہ ہے، قرآن مجید اور تاریخ اسلامی کی روشنی میں جائزہ لیا اور اس کی بنیاد مسلمانوں کے دین وایمان کو قرار دیا ہے مولانا فرماتے ہیں کہ:

''بین الاقوامی معاملات میں تمہاری پالیسی بزدلانہ نہیں ہونی چاہیے بلکہ خدا کے بھروسہ پر بہادرانہ اور دلیرانہ ہونی چاہیے، دشمن جب گفتگوئے مصالحت کی خواہش ظاہر کرے، بے تکلف اس کے لیے تیار ہو جاؤ اور سلح کے لیے ہاتھ بڑھانے سے اس بناء پر انکار نہ کرو کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ سلح نہیں کرنا چاہتا بلکہ غداری کا ارادہ رکھتا ہے۔ کسی کی نیت بہرحال یقینی طور پر معلوم نہیں ہوسکتی ہے اگر وہ واقعی سلح کی نیت رکھتا ہو تو تم خواہ مخواہ اس کی نیت پر شبہ کر کے خون ریزی کو طول کیوں دو اور وہ غدر کی نیت رکھتا ہو تو تمہیں خدا کے بھروسے پر بہادر ہونا چاہیے سلح کے لیے بڑھنے والے ہاتھ کے جواب میں ہاتھ بڑھاؤ تاکہ تمہاری اخلاقی برتری ثابت ہو اور لڑائی کے لیے اٹھنے والے ہاتھ کو اپنے قوت بازو توڑ کر پھینک دو تاکہ کبھی کوئی غدار قوم تمہیں نرم چارہ سمجھنے کی جرات نہ کرے''۔ ۵۲

قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) کے بعد مولانا مودودیؒ تقریباً ۳۲ سال (م ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء) تک حیات رہے، تین دہائیوں پر مشتمل یہ زمانہ مولانا کی دینی وعلمی سرگرمیوں کے علاوہ عملی

سیاسی جدوجہد سے بھی عبارت ہے انھوں نے ایک فعال سیاستدان اور قومی رہنما کی حیثیت سے قومی وسیاسی امور ومسائل اور تحاریک میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ہم اس دور میں پاکستان کی قومی سیاست میں مولانا مودودیؒ کے کردار کے چند منتخب واقعات کا جائزہ لیں گے۔

☆ مطالبہ نظام اسلامی:

قیام پاکستان کے بعد مولانا مودودیؒ نے محسوس کیا کہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے لیے جو تحریک پاکستان برپا کی گئی تھی اور جس کے لیے برعظیم کے مسلمانوں نے بے مثال قربانیاں پیش کی تھیں ان مقاصد سے انحراف کیا جارہا ہے۔ مولانا نے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''ہماری قوم کے قائدین نے جواب قائد ہی نہیں حاکم بھی تھے ملک کے آئندہ نظام کے متعلق جیسی الجھی الجھی اور متضاد باتیں شروع کیں اور قوم جس طرح ابتدائی چند مہینوں میں ٹھنڈے دل سے ان کو سنتی رہی اسے دیکھ کر صاف معلوم ہوگیا کہ اس وقت ایک بے شعور قوم کی باگیں ایک بے فکر گروہ کے ہاتھ میں ہے اس وقت خاموش بیٹھ کر تعمیری کام میں لگے رہنے کا نہیں ہے اب اگر ایک لمحہ بھی ضائع کیا گیا تو بعید نہیں کہ جو لوگ منزل کا تعین کیے بغیر بے سوچے سمجھے چل پڑتے تھے وہ یا یک کسی غلط نظریے کو بنیاد بنا بیٹھیں اور پھر اس فیصلے کو بدلوانا موجودہ حالات کی بہ نسبت ہزار گنی قربانیوں کے بغیر ممکن نہ رہے''۔ ۵۳

اس صورتحال کے تناظر میں مولانا مودودیؒ نے ۱۹۴۸ء میں جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم سے اسلامی نظام کے مطالبہ کی ایک منظم تحریک شروع کی یہ تحریک نظریاتی وسیاسی بھی تھی اور عوامی بھی۔ مولانا نے ریڈیو پاکستان سے ''اسلامی نظام حیات'' کے عنوان سے تقاریر کا سلسلہ شروع کیا۔ یونیورسٹی لاء کالج میں اسلامی قانون کے نفاذ کی علمی تدابیر اور پاکستان کو ایک آئینی اور جمہوری ریاست بنانے کے حوالے سے ٹھوس دلائل پیش کرکے رائے عامہ کو اسلامی نظام کے حق میں ہموار کیا۔ ۵۴

مولانا مودودیؒ اسلامی نظام کے نفاذ کا چار نکاتی مطالبہ ۵۵ لے کر ملک کے گوشے گوشے میں گئے، جلسے کیے اور لوگوں کو بتایا کہ اسلامی ریاست حقیقت میں کس قسم کی ریاست

ہوتی ہے۔ ۵۶

اسلامی نظام کے نفاذ کے مطالبہ نے ملک میں طاری سیاسی جمود میں ایک ہلچل پیدا کردی..... جماعت اسلامی کے ہزاروں کارکن پورے جذبہ وجوش کے ساتھ اس مہم میں سرگرم عمل ہوگئے، ملک کا کوئی شہر اور قصبہ ایسا باقی نہیں رہا جس کی دیواروں پر جلی حروف میں ''ہمارا مطالبہ اسلامی انقلاب'' لکھا ہوا نہ ہو، اس کے علاوہ ''پاکستان کا قانون اسلامی شریعت'' ..... ''حاکمیت صرف خدا کی'' وغیرہ دوسرے نعرے لکھے ہوتے۔ ہر موڑ اڈے اور اسٹیشن پر اور ہر ایک مسجد میں اس مطالبے کے پوسٹر لگ گئے، مساجد میں خطیبوں نے اس مطالبے کے حق میں خطبے دیے اور لوگوں نے اس کے حق میں ہاتھ بلند کیے۔ چھوٹے بڑے بے شمار جلسے کرکے جماعت اسلامی نے اس مطالبے کو مہمیز لگائی۔ جدید تعلیم یافتہ طبقے تک اپنے پمفلٹ، کتابچے اور کتابیں پہنچائیں، لاکھوں کی تعداد میں پوسٹ کارڈ چھپ گئے جن کے ایک حصے میں چار نکاتی مطالبہ درج ہوتا تھا اس طرح یہ مطالبہ تحریک پاکستان کی صدائے بازگشت محسوس ہونے لگا۔ ۵۷

مولانا مودودیؒ نے اس مطالبہ کو کروڑوں باشندوں کا مطالبہ بنادیا ایک موقع پر مولانا نے اس اقدام کے بارے میں فرمایا تھا کہ:

''یہ مطالبہ جماعت اسلامی کی طرف سے باطل قوتوں کے محاذ پر معمولی سی چوٹ نہیں تھی ایک شاہ ضرب تھی''۔ ۵۸

اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ اور مولانا مودودیؒ کی سیاسی تحریک سے حکمراں طبقہ بوکھلا گیا اس کی نیندیں حرام ہوگئیں، مولانا مودودیؒ کی سرگرمیوں کی خفیہ اداروں کے ذریعے نگرانی شروع کردی گئی اور ان کے خلاف الزام وبہتان تراشی کی ایک جھوٹی پروپیگنڈہ مہم شروع ہوگئی۔ حکومت نے مولانا مودودیؒ پر جہاد کشمیر کو حرام قرار دینے اور تحریک پاکستان کی مخالفت کا بہتان عائد کیا۔ اسی کے ساتھ ریاستی مشینری حرکت میں آئی اور مولانا اور جماعت اسلامی کے خلاف انتقامی کاروائیوں کا آغاز ہوگیا اور ۴، اکتوبر ۱۹۴۸ء کو مولانا مودودیؒ اور ان کے رفقاء کو گرفتار کرکے جیل میں نظر بند کردیا گیا۔

حکومت کا خیال تھا کہ مولانا مودودیؒ کی نظر بندی کے بعد اسلامی نظام کے نفاذ کی

تحریک سرد ہوجائے گی لیکن یہ تحریک نہ صرف جاری رہی بلکہ اپنے قائد کی نظر بندی اور استقامت نے اسے نیا عزم و حوصلہ دیا اور عوام کے اشتراک و تعاون سے اس میں مزید شدت پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے، اب حکومت کے سامنے کوئی اور راستہ نہ تھا کہ وہ مولانا مودودیؒ کے مطالبہ کے آگے سر خم تسلیم کردے چنانچہ ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو دستور ساز اسمبلی نے ''قرارد مقاصد'' کی منظوری دی جس کی رو سے اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے اقرار کیا گیا کہ کوئی ادارہ بھی اس کے بنائے ہوئے قوانین سے انحراف نہیں کرسکتا۔ قرارداد مقاصد کی منظوری پر وزیر اعظم لیاقت علی خان نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

''یہ ہمارے ملک کی تاریخ میں خود ملک کے قیام کے بعد دوسرا بڑا واقعہ ہے''۔ ۵۹

پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریک میں مولانا مودودیؒ موثر اور فیصلہ کن کردار کی متعدد جہتیں ہیں مثلاً مولانا نے عوام میں سیاسی و نظریاتی بیداری اور جدوجہد کا شعور دیا اور عوامی طاقت کا لوہا منوایا یہ تحریک اس اعتبار سے بھی مثالی تھی کہ اس کی بنیاد پرامن سیاسی جدوجہد پر تھی مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس تحریک میں مولانا کے کردار نے ملک میں اسلام اور شریعت کے خلاف ہر آئینی اور قانونی دروازہ بند کردیا۔

☆ مطالبہ دستور اسلامی :

قرارداد مقاصد کی منظوری مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی سمیت ملک کے تمام مکاتب فکر کے علماء کرام اور اسلام پسند عوام کی تاریخی کامیابی تھی مولانا نے اسے تحریک اسلامی کے لیے اہم نقطہ انقلاب قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

''اب اس ریاست کی شرعی حیثیت سابقہ غیر مسلم ریاست سے بالکل مختلف ہوچکی ہے، مسلم قوم اور پاکستانی مملکت کا نصب العین واضح صورت میں متعین ہوگیا اور اس نے ایک پختہ آئینی شکل اختیار کرلی، مملکت پاکستان اصولاً ایک اسلامی مملکت میں تبدیل ہوگئی ہے''۔ ۶۰

بیس ماہ کی نظر بندی کے بعد مولانا مودودیؒ اور ان کے رفقاء (میاں طفیل محمد اور مولانا امین احسن اصلاحی) لاہور ہائی کورٹ کے حکم پر رہا ہوئے۔ مولانا نے وطن عزیز میں غلبہ اسلام کے لیے بیس ماہ کی اسیری کیسے کاٹی یہ خود ایک داستان ہے اس کے بارے میں صرف اتنا

کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ایام اسیری کو اپنے اسلاف کی عزیمت و استقامت کی سنت و روایت کے ساتھ اس طرح برداشت کیا کہ اپنے علمی کاموں کو متاثر نہیں ہونے دیا اور خودی و خودداری کا مثالی نمونہ پیش کیا۔

مسلم لیگی قیادت نے عوامی دباؤ پر قرارداد مقاصد تو منظور کرلی لیکن دستور سازی میں وہ مسلسل لیت و لعل سے کام لے رہی تھی دستور سازی کے عمل کو مختلف حیلے بہانوں سے ٹالا جا رہا تھا ظاہر ہے قرارداد مقاصد میں صرف چند بنیادی اصول تسلیم کیے گئے دستور کا نعم البدل نہیں ہوسکتے تھے چنانچہ جب ایک بار پھر دستور سازی کے مطالبہ نے زور پکڑا تو ۱۹۴۹ء کو بنیادی اصولوں کی کمیٹی Basic Principles Committe تشکیل دی گئی جس نے تقریباً ۲۱ ماہ بعد (۲۸ ستمبر ۱۹۵۰ء) کو اپنی رپورٹ آئین ساز اسمبلی میں پیش کی ایک تو رپورٹ تاخیر سے پیش کی گئی دوسری کمیٹی کی سفارشات عوامی اور سیاسی جماعتوں کی امنگوں کے مطابق نہیں تھی جس کے باعث رپورٹ پر کڑی تنقید کی گئی پورے ملک میں (مشرقی اور مغربی پاکستان) میں شدید ردعمل ہوا۔ ۶۱

مولانا مودودیؒ نے کمیٹی کی سفارشات کے خلاف لاہور میں تاریخی موچی دروازے میں عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جلسہ میں مولانا نے تفصیلی خطاب کیا اس خطاب میں تحریک پاکستان کے مقاصد کے تناظر میں دستور کی اہمیت اور قومی زندگی میں اس کے اثرات، اسلامی حکومت کے اصولوں بیان کیے اور کمیٹی کی سفارشات جیسے امتناعی (Preventive Detention) صدر کے امتیازی حقوق، سرکاری عہدوں کے امتیازی حقوق، دو ایوانی پارلیمنٹ، ترمیم دستور کی مشکلات اور موجودہ قانون ساز اسمبلی کی نااہلی کا تفصیلی پوسٹ مارٹم کرکے سفارشات کی دھجیاں اڑادیں انہوں نے کہا کہ:

''یہ بے وفائی صرف اس حد تک نہیں ہے کہ پیش کردہ دستوری خاکہ اسلامی خصوصیات سے خالی ہے۔ نہیں، اس منفی پہلو کے ساتھ مثبت پہلو یہ ہے کہ اس خاکے میں متعدد ایسی چیزیں رکھی ہیں جو صریح طور پر اسلام کے خلاف ہیں اور متعدد چور دروازے ایسے رکھے گئے ہیں جن سے شرعی قوانین کے نفاذ کو روکنے کا راستہ نکل سکتا ہے''۔ ۶۲

☆ علماء کے ۲۲ نکات:

پاکستان بھر میں عوام کے شدید ردعمل اور جذبات کا رخ دیکھتے ہوئے حکومت کی درخواست پر کمیٹی کی تجاویز کو التواء میں ڈال کر عوام سے ترامیم اور تجاویز طلب کر لی گئیں اگر بدگمانی نہ ہو تو یہ معاملات کو التواء میں رکھنے کا ریاستی حربہ تھا اور عوام میں اختلافات پیدا کرنے کی سازش تھی۔ حکومت کا خیال تھا کہ اس تجویز سے مختلف الخیال مذہبی طبقے کسی متفقہ دستوری نکات پر متحد نہ ہوسکیں گے اس طرح انہیں اپنے مقاصد میں کامیابی ہوجائے گی لیکن یہاں بھی مولانا مودودیؒ نے حکومتی عزائم کو بھانپ لیا اور تمام مکاتب فکر کے ۳۱ جید علماء کو ۲۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو جمع کیا چار روز کے غور وفکر کے بعد علمائے امت کے اس بے مثال اجتماع میں جس کی نظیر مسلمانوں کی ماضی قریب کی تاریخ میں نہیں ملتی بائیس اصول اتفاق رائے سے منظور کر کے ایک طرف دستور سازی میں رکاوٹ کے حربوں وہتھکنڈوں کو ناکام بنادیا تو دوسری طرف سیکولر دستور کے امکانی راستہ کو بھی بند کر دیا۔ ۹۵

☆ پنجاب کے صوبائی انتخابات (۱۹۵۱ء):

ابھی دستور سازی کے تقاضے اور مراحل مکمل نہیں ہوئے تھے کہ اس کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے پنجاب اسمبلی کے انتخابات کا اعلان کر دیا گیا۔ مولانا مودودیؒ اپنی جماعت کے ساتھ پہلی بار انتخابی سیاست کے میدان میں اترے اور ایک نیا انتخابی کلچر متعارف کرایا انہوں نے جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد، اس کے مقاصد اور طریق کار کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھا، انتخابی منشور پیش کیا اور رابطہ عوام مہم شروع کی گئی۔ جماعت اسلامی کی جانب سے انتخاب میں حصہ لینے کا اعلان ہوتے ہی ریاستی اور غیر ریاستی، تمام ایجنٹ حرکت میں آ گئے اور مولانا مودودیؒ کے خلاف مخالفت کا ایک طوفان کھڑا کر دیا ان میں علماء بھی شامل تھے اور حکمران بھی بالخصوص ملک کا سیکولر طبقہ اور زرد صحافت کے علمبردار بھی موجود تھے۔ ۹۶ مولانا مودودیؒ نے اس مخالفت کو رنج ذکر کا عنوان قرار دیتے ہوئے ۱۰ نومبر ۱۹۵۱ء کو کراچی میں جماعت اسلامی کے چار روزہ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

''اس مخالفت نے آپ کی تحریک کے لیے بڑھنے اور ابھرنے کا جو ایک غیر معمولی

موقع فراہم کر دیا ہے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایئے یہ اللہ نے آپ کے رنج ذکر کا سامان کیا ہے اس سے گھبرایئے نہیں بلکہ اس سے کام لیجیے عرب میں اسی نوعیت کے پروپیگنڈے کا طوفان جب نبی ﷺ کے خلاف اٹھا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو خوشخبری دی تھی کہ ورفعنا لک ذکرک۔ ہمیں تو شکرگزار ہونا چاہیے کہ ایک طرف ایک گروہ سر کھپا کر ملا زمین سے ہمارا تعارف اور بڑا وزنی تعارف کرا رہا ہے دوسری طرف تمام گمراہ گروہ اپنے اپنے حلقوں میں ہم کو روشناس کرانے میں لگے ہوئے ہیں''۔ ۹۷

انتخابات میں جماعت اسلامی اپنے خلاف دباؤ، دھونس دھاندلی کے تمام ہتھکنڈے استعمال کرنے کے باوجود ۲ لاکھ ۸ ہزار ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی اگر یہی انتخابات متناسب نمائندگی کی بنیاد پر ہوتے تو جماعت اسلامی کے پنجاب اسمبلی میں بیس سے پچیس نمائندے آجاتے۔ ۹۸

☆ سیکولر دستور کی منظوری کا منصوبہ:

مولانا مودودیؒ نے فرمایا تھا کہ:

''دستور سے مراد وہ اصول اور ضوابط ہوتے ہیں جن پر کسی مملکت کی بنیاد رکھی جاتی ہے اس میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ ریاست کی تشکیل کس طرح کی جائے گی اسکا انتظام کرنے والی حکومت کن ضابطوں اور کن اصولوں کی پابند بنائی جائے گی حکمرانی کے اختیارات کن لوگوں کے ہاتھوں میں دیئے جائیں گے ان کو کسطرح چنا جائے گا ان کو کیا اختیارات دیئے جائیں گے۔ باشندگان ملک کے کیا حقوق وفرائض ہوں گے۔ دستور میں یہ بھی طے کیا جاتا ہے کہ مملکت کے قوانین کی نوعیت کیا ہوگی وہ خدا کی شریعت پر مبنی ہوں گے یا انسانوں کی بنائی ہوئی شریعت پر ...... یہ ایسے معاملات ہیں اگر ان کے طے کرنے میں غفلت اور سہل انگاری برتی جائے تو ایک ریاست اپنے مسلمان باشندوں کی خواہش کے خلاف ایک غیر اسلامی نقشے پر تعمیر ہوسکتی ہے جو حدود اللہ کی پابندی سے آزاد اور خدائی قانون توڑنے کی مجاز ہوگی۔ ۹۹

دستور کا اس قدر واضح ادراک وشعور رکھنے والے مولانا مودودیؒ سے یہ توقع عبث تھی کہ وہ کسی ایسے دستور کی تشکیل کی اجازت دیں گے جو مملکت اور اس کے باشندوں کا قبلہ ہی

تبدیل کردے۔ چنانچہ پنجاب کے صوبائی انتخابات کے بعد مولانا مودودیؒ نے علماء کرام کے ۲۲ نکات کو سموتے ہوئے دستور ساز اسمبلی کو ۸ نکاتی مطالبہ پیش کیا حکومت نے ۲۲ نومبر ۱۹۵۲ء کو اسمبلی میں دستوری سفارشات پیش کرنے کا اعلان کیا۔ مولانا مودودیؒ کی قیادت میں کراچی میں ۲۱ نومبر ۱۹۵۲ کو تاریخی مظاہرہ ہوئے جس میں اسمبلی کو واضح پیغام دیا کہ قوم کسی سیکولر (لادینی) دستور کو قبول نہیں کرے گی یہ پیغام اتنا واضح اور موثر تھا کہ حکومت نے اسمبلی میں لادینی دستور پیش کرنے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔[۱]

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی دستور سازی کی تشکیل میں یہ اسلام پسندوں اور لادین عناصر کے درمیان فیصلہ کن کشمکش تھی جس میں اسلام پسندوں کا پلڑا بھاری رہا۔

☆ "فاتح تختہ دار مودودیؒ":

لادینی دستور کے منظوری کے منصوبہ کی ناکامی حکومت کی بہت بڑی ہزیمت اور پسپائی تھی وہ انتقام کی آگ میں سلگ رہی تھی لیکن براہ راست مولانا مودودیؒ پر ہاتھ ڈالنے کا مطلب یہ تھا کہ اُس کے مزائم آشکار ہو جائیں قوم مولانا مودودیؒ کی حمایت میں اس طرح نہ اُٹھ کھڑی ہو جائے کہ ان کا اقتدار کا سنگھاسن ہی ہل جائے۔ چنانچہ ایک منصوبہ کے تحت اسلامی دستور کے مطالبہ کو تحلیل کرنے کے لیے قادیانیوں کے لیے ختم نبوت کی تحریک اُٹھائی گی، مولانا اس کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"میں صاف صاف کہتا ہوں کہ ختم نبوت کی تحریک اٹھوائی اس غرض کے لیے گئی تھی مطالبہ اسلامی نظام کو روکا جائے اس موقع پر ختم نبوت کی تحریک کے لیڈروں کو بہتیرا سمجھا یا گیا کہ خدا کے لیے ایک مرتبہ دستور پاس ہو جانے دو اس کے بعد تم اس مسئلے کو اُٹھا سکتے ہو، خواجہ ناظم الدین کی رپورٹ تیار ہو چکی تھی، دستور پاس ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہ تھی صرف اتنا کام باقی تھا کہ دستور ساز اسمبلی میں بنیادی اصولوں کی رپورٹ پیش ہو اور دستور پاس ہو جائے لیکن عین وقت پر ہنگامہ برپا کردیا گیا خواجہ ناظم الدین کی رپورٹ دھری کی دھری رہ گئی، لاہور میں مارشل لاء لگا دیا گیا خواجہ ناظم الدین وزارت عظمیٰ سے رخصت کر دیئے گئے اور بیوروکریسی اسطرح ملک کے سینے پر سوار ہوئی کہ آج تک اس سے پیچھا نہ چھڑایا جا سکا"۔[۱]

۲۸ مارچ ۱۹۵۳ کو مولانا مودودیؒ کو "قادیانی مسئلہ" نامی ایک کتابچہ لکھنے کی آڑ میں گرفتار کرلیا گیا گرفتار شدگان میں میاں طفیل محمد اور مولانا امین احسن اصلاحی سمیت دیگر اکابرین جماعت بھی شامل تھے۔ لاہور قلعہ میں ایک فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور قادیانی پمفلٹ لکھنے کے "جرم" میں مولانا مودودیؒ کو موت کی سزا سنادی گئی فوجی افسر نے سزا سناتے ہوئے کہا کہ مارشل لاء کے تحت سزاؤں کے خلاف اپیل کا کوئی حق نہیں ہے، آپ چاہیں تو اپنی موت کی سزا کے خلاف سات دن کے اندر مسلح افواج پاکستان کے کمانڈر انچیف سے رحم کی اپیل کر سکتے ہیں"۔[۲]

مولانا مودودیؒ نے انتہائی باوقار لہجے میں فوجی افسر کو جواب دیا کہ:

"مجھے کسی سے کوئی اپیل نہیں کرنی ہے زندگی اور موت کے فیصلے زمین پر نہیں آسمان پر ہوتے ہیں اگر وہاں میری موت کا فیصلہ ہو چکا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے موت سے نہیں بچا سکتی اور اگر وہاں سے میری موت کا فیصلہ نہیں ہوا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی"۔[۳]

مولانا مودودیؒ کو پھانسی کی سزا کے بعد "پھانسی کوٹھری" میں لے جا کر بند کردیا گیا سزائے موت کے بعد مولانا کے ساتھ جو سلوک ہوا، ایک الگ داستان ہے لیکن مولانا نے دار و رسن کی آزمائش کو استقامت و پامردی کے ساتھ برداشت کر کے ایک بار پھر اسلاف کی عزیمت و استقامت کی یاد تازہ کر دی۔

مولانا مودودیؒ کو موت کی سزا کے خلاف پورے ملک میں احتجاجی مظاہروں، ہڑتالوں، جلسہ و جلوسوں کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا، عالم اسلام ہی نہیں غیر مسلم ممالک کے مسلمانوں نے بھی حکومت سے مولانا کی سزا کی منسوخی کا مطالبہ کیا اس عالمگیر دباؤ پر حکومت نے سزائے موت عمر قید میں بدل دی۔ بعدازاں قانونی اور عدالتی چارہ جوئی کے نتیجے میں ۲۸ مئی ۱۹۵۵ء کو مولانا کو ملتان ڈسٹرکٹ جیل سے رہا کر دیا۔[۴]

☆ دستور ۱۹۵۶ کی منظوری:

قیام پاکستان کے تقریباً ۹ سال بعد ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ کو مولانا مودودیؒ کی قیادت میں

عوامی جدوجہد اور چودہری محمد علی کی پرخلوص محنت اور لگن کے نتیجے میں دستور ساز اسمبلی نے آئین کی منظوری دی، ۱۹۵۶ء کے آئین کا مقصد پاکستان میں اسلامی اصولوں پر مبنی ایک وفاقی اور پارلیمانی حکومت کا قیام تھا۔۵؎

مولانا مودودیؒ نے دستور کی منظوری پر قوم سے ایک مفصل پیغام میں کہا کہ:

''ہم اپنی زندگی کی ابتداء ایک ایسی آزاد قوم کی حیثیت سے کر رہے ہیں جس نے آئینی طور پر خداوند تعالیٰ کی حاکمیت کا اقرار کیا اور اقتدار کو اسکی طرف سے ایک مقدس امانت مان کر، استعمال اقتدار کے لیے اس کی مقرر کردہ حدود کی پابندی قبول کی ہے آج دنیا کی تمام قوموں کے درمیان ہم وہ تنہا قوم ہیں جس نے اپنے دستور مملکت کے سرنامے پر یہ اعلان ثبت کیا ہے کہ ہم جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور اجتماعی انصاف کے اس تصور پر عمل کریں گے جو اسلام نے ہم کو دیا ہے''۔۶؎

☆ آمریت کے خلاف جدوجہد:

مولانا مودودیؒ کی وطن عزیز کے لیے سیاسی و نظریاتی خدمات اور کردار کا احاطہ کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے ہم آخر میں مولانا مودودیؒ کی قومی آمریت کے خلاف جدوجہد کا اختصار سے جائزہ لیں گے۔ ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو جنرل محمد ایوب خان نے فیروز خان نون کو برطرف کر کے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا جس رات مارشل لاء نافذ کیا گیا مولانا مودودیؒ لاہور میں ایک جلسۂ عام میں خطاب کے دوران فرما رہے تھے کہ:

''آج حالت اتنی خراب ہو چکی ہے کہ کچھ نہیں کہہ جاسکتا کہ دوسرے لمحے کیا ہو جائے آپ رات کو اس حالت میں سوئیں کہ ملک پر آئین کی حکومت قائم ہے مگر جب صبح اٹھیں تو معلوم ہو بساط آئین لپیٹی جا چکی ہے اور اقتدار پر کوئی شخص واحد مسلط ہے''۔۷؎

مولانا مودودیؒ کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ اس قدر جلد حقیقت بن جائیں گے اس کا کسی کو چند گھنٹے قبل تک گمان بھی نہ تھا لیکن جو لوگ مولانا کی بصیرت سے واقف تھے ان کے لیئے اس میں حیرانگی کا کوئی پہلو نہ تھا۔ یہاں ضمناً عرض ہے کہ مولانا مودودیؒ نے قومی اور بین الاقوامی معاملات پر ایسی متعدد پیش گوئیاں کی ہیں جو بعد میں حقیقت بن کر سامنے آئیں

جسے یقیناً مولانا کی دینی علمی اور سیاسی بصیرت (Vision) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

جنرل محمد ایوب خان برسر اقتدار آئے تو انھوں نے بادشاہوں کی طرح فرامین جاری کرنا شروع کر دیئے، مارچ ۱۹۶۱ء میں عائلی قوانین نافذ کیے جو مسلمانوں کے پرسنل لاء میں کھلی مداخلت تھی۔ علماء کرام نے اس کا نوٹس لیا اور حکومت کے اس اقدام کے خلاف لاہور میں تمام مکاتب فکر کے علماء کا اجتماع ہوا جس میں مولانا مودودیؒ بھی شریک ہوئے علماء نے ایک مشترکہ بیان جاری کرتے ہوئے اس پر تنقید کی اور مثبت تجاویز بھی دیں لیکن حکومت سے عائلی قوانین پر تنقید ہضم نہ ہو سکی جماعت اسلامی کے سیکریٹری جنرل محترم میاں طفیل محمد کو اکتوبر ۱۹۶۱ میں گرفتار کر لیا وہ تقریباً نو ماہ تک نظر بند رہے۔

حکومت نے اپنے پورے دور میں مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کی سرگرمیوں کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ بیرون ملک دعوتی دوروں کو روکا، ان کی سرگرمیوں کی خفیہ نگرانی کرائی گئی۔

جنرل ایوب خان کو اپنے آمرانہ اقتدار کے خلاف عوامی ناپسندیدگی کا اندازہ ہو رہا تھا اس لیے دستور کو معطل کرنے کے بعد دستور کی بحالی کے لیے ایک دستوری کمیشن قائم کیا دستوری کمیشن نے ایک سوالنامے کے ذریعے عوام و خواص سے آراء و تجاویز طلب کی لاہور میں مفتی محمد حسین کے ہاں جید علماء کرام کا اجلاس ہوا جس نے کمیشن کے سوالنامے کا جواب دے لیکن حکومت نے اس پر اجلاس میں علماء کی سرزنش کی، مولانا مودودیؒ کو پنجاب یونیورسٹی میں طلبا نے دستوری کمیشن پر مذاکرے میں شرکت اور خطاب کی دعوت دی جسے حکومت نے پولیس کے ذریعے درہم برہم کرا دیا۔

☆ ۱۹۶۲ کے دستور کی مخالفت:

جنرل ایوب خان نے ملک کو تقریباً چار سال تک بغیر دستور کے چلایا اور یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو ایک نیا دستور دیا۔۸؎

یہ دستور جمہوری روح کے منافی تھا مولانا مودودیؒ وہ واحد سیاستدان تھے جنہوں نے پوری جرأت اور بے باکی سے اس دستور پر حکومت کی گرفت کی اس دستور پر انہوں نے

ایک مفصل تنقید لکھی روزنامہ سول ملٹری گزٹ لاہور نے مولانا مودودیؒ کے جاری کردہ بیان کی سرخی ان الفاظ میں لگائی کہ :

''یہ دستور جمہوری ہے نہ اسلامی''۴۹

۱۹۶۲ء میں جنرل ایوب خان نے سیاسی جماعتوں کی سرگرمیوں پر سے پابندی اُٹھائی تو جماعت اسلامی دوبارہ پوری طرح فعال ہوگئی۔

☆ ریاستی دہشت گردی:

جماعت اسلامی کی مرکزی شوریٰ نے اکتوبر ۱۹۶۳ء میں کل پاکستان اجتماع عام کا اعلان کیا تو ایک طرف کارکنان جماعت میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تو دوسری طرف حکومت کی نیندیں اڑ گئیں حکومت نے اجتماع عام کو ناکام بنانے کے لیے اوچھے ریاستی ہتھکنڈے کا استعمال کرنا شروع کر دیے اجتماع روکنے کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال نہیں کیے گئے ۔ یہاں تک کہ، ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو لاؤڈ سپیکر کی پابندی کے باوجود اجتماع میں مولانا مودودیؒ کی تقریر جاری تھی کہ پولیس کی سرپرستی میں غنڈہ عناصر نے اجتماع گاہ پر فائرنگ اور بلہ بول دیا یہ غنڈہ عناصر ایوب خان زندہ باد کے نعرے بلند کر رہے تھے ۔ فائرنگ کے نتیجے میں ایک کارکن اللہ بخش شہید ہو گئے ، گولیوں کی بوچھاڑ جاری تھی شرکاء نے مولانا کے گرد حصار قائم کر دیا چوہدری غلام محمد صاحب مرحوم نے ازراہ احتیاط کہا کہ :

''مولانا آپ بیٹھ جائیں ،مناسب یہی ہے :

مولانا نے اس موقع پر یہ تاریخی جواب دیا کہ :

''چوہدری صاحب !میں بیٹھ گیا تو پھر اور کون کھڑا ہوگا''۔ ۵۰

☆ بنیادی حقوق کی بحالی:

مولانا نے تمام تر ریاستی دہشت گردی کے باوجود ناموس دستور کا علم ایک بار پھر بلند کر دیا اور ۶۲ء کے دستور کی غیر اسلامی اور غیر جمہوری دفعات کے خاتمے کے خلاف تحریک شروع کی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ ریاست کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا جائے ، بنیادی حقوق بحال کیے جائیں اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کرائے جائیں .....مولانا مودودیؒ

اور جماعت اسلامی کی بحالیٔ دستور و جمہوریت کی یہ تحریک حکمراں کو سخت ناگوار گزری جنوری ۱۹۶۴ء میں ایک بار پھر مولانا مودودیؒ کو گرفتار کر کے جیل میں نظر بند اور جماعت اسلامی کو غیر قانونی قرار دیا گیا ملک بھر میں جماعت اسلامی کے دفاتر سیل کر کے اثاثے ضبط کر لیے گئے اور ترجمان القرآن کی اشاعت پر چھ ماہ کی پابندی عائد کر دی گئی ۔ جولائی ۱۹۶۴ء کو شرقی پاکستان ہائی کورٹ نے پھر سپریم کورٹ آف پاکستان نے ستمبر ۱۹۶۴ء میں جماعت اسلامی پر پابندی کو آئینی حقوق سے متصادم قرار دیتے ہوئے بحال کر دیا اور اکتوبر ۱۹۶۴ء کو مغربی پاکستان ہائی کورٹ نے مولانا مودودیؒ اور دیگر اکابرین جماعت کی نظر بندی کی سماعت کی اور ۹ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو رہائی کا حکم دیدیا۔۵۱

☆صدارتی انتخابات:

۳جنوری ۱۹۶۵ء کو صدارتی انتخابات ہوئے ایوب خان کے مقابلہ میں بابائے قوم قائداعظم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح تھیں مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی نے صدارتی انتخاب میں محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ کیا۔

☆ جہاد پاکستان:

۶ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو مولانا مودودیؒ دفاع وطن کے لیے قوم کی رہنمائی کے لیے میدان عمل میں آگئے اورانہوں نے اپنے ایک مفصل بیان میں کہا کہ :

''پاکستان کو دارالاسلام کی حیثیت حاصل ہے اور اس کا دفاع بلاشبہ جہاد ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ خون کا آخری قطرہ بہہ جانے تک پاکستان کی ایک انچ زمین پر بھی دشمن کے قدم نہ بڑھنے دے''۔ ۵۲

☆ آمریت کے خلاف تحریک:

ایوبی آمریت کے خلاف عوامی جذبات میں شدت آتی جارہی تھی ۱۹۶۵ء کے آغاز سے آمریت کے خلاف شدت میں اضافہ ہوگیا، ۲۷جنوری ۱۹۶۵ء کو حزب اختلاف کی پرشکوہ احتجاجی ریلی نے ایوبی آمریت کے کس بن ڈھیلے کر دیے اور وہ مذاکرات کی میز سجانے پر مجبور ہوگئے ۔مذاکرات ہوئے اس میں مولانا مودودیؒ نے بھی شرکت کی اور حزب اختلاف کے متفقہ

مطالبہ حق بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخاب اور وفاقی پارلیمانی نظام کی بحالی پر زور دیا مولانا نے ایوب خان کے ساتھ مذاکرات کے دوران ایک حقیقت پسندانہ اور اصولی تقریر کی۔ ایوب خان نے دونوں مطالبات تسلیم کر لیے لیکن بعض طالع آزماؤں نے ہوس اقتدار میں نفرت کی ایک ایسی خلیج پیدا کر دی جس سے لسانی علاقائی عصبیت کی آگ کو اس قدر بھڑکایا کہ پورا ملک جل اٹھا۔ ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو ایوب خان صدارت نے استعفیٰ دے کر اقتدار کمانڈر انچیف جنرل آغا محمد یحییٰ خان کے حوالے کر دیا۔۸۴

☆ مشرقی پاکستان کے مستقبل کی پیش گوئی:

ایوب خان کے استعفیٰ کے بعد سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا تو دس سالہ آمریت کا عفریت بدامنی، تشدد، انتہاپسندی اور علیحدگی کے اژدھے کی صورت میں سامنے آگیا ہر طرف جلاؤ گھیراؤ بالخصوص مشرقی پاکستان بارود کا ڈھیر بنا ہوا تھا مولانا مودودیؒ نے صحت کی خرابی کے باوجود مشرقی پاکستان میں عصبیت کی آگ پر پانی ڈالنے کے لیے سفر کا فیصلہ کیا اس سفر کی سنگینی کا مولانا کو پورا ادراک تھا اسی لیے فرمایا کہ:

"مشرقی پاکستان کے حالات ایسے ہیں کہ میں جان پر کھیل کر وہاں جا رہا ہوں"

۱۸ جنوری ۱۹۷۰ء کو ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں مولانا مودودیؒ کی صدارت میں ہونے والے جلسے کو غنڈوں نے حملہ کر کے تہس نہس کر دیا انہوں نے جلسے میں غنڈہ گردی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا اور کیا سچ کہا تھا کہ:

"اگر حالات اسی ڈگر پر چلتے رہے تو اندیشہ ہے کہ ہر علاقے سے متعصب لوگ کامیاب نہ ہو جائیں جب یہ انتہاپسند لوگ کامیاب ہو گئے تو یہ پاکستان کو جوڑنے کے لیے نہیں ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے اٹھیں گے''۔۸۵

پاکستان بچانے اور اس کی وحدت کو قائم رکھنے کے لیے مولانا مودودیؒ بہ نفس نفیس میدان میں اترے اور پاکستان دشمن عناصر کو پوری جرات کے ساتھ للکارا لیکن ارباب حل وعقد کی آنکھوں پر پٹی اور کانوں میں روئی ٹھنسی ہوئی تھی انہوں نے اپنا فرض ادا نہیں کیا جس کا انجام پاکستان کے دولخت ہونے کی صورت میں سامنے آیا اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا یہ

پاکستان کے جغرافیہ اور نظریہ پر ایسی ضرب شدید تھی جس کا زخم شاید کبھی نہ بھر سکے۔

☆ سوشلزم کے خلاف فکری اور قلمی جہاد

لادین عناصر دستوری محاذ پر اسلام پسند قیادت اور جماعتوں کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہے تھے انہوں نے سوشلزم کے فلسفہ معیشت کے ذریعے قوم کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ان کا اصل ہدف اسلام اور جماعت اسلامی تھی، مولانا مودودیؒ سرخ سامراج کا مقابلہ کرنے کے لیے خود میدان میں نکلے ۳۱ مئی ۱۹۷۰ء کو یوم شوکت اسلام منانے کا اعلان کیا پورا ملک شوکت اسلام کے جلسہ جلوسوں اور اسلام کے نعروں سے گونج اٹھا لاہور میں شوکت اسلام کے جلوس کی قیادت مولانا مودودیؒ نے کی گول باغ میں جلوس کے اختتام پر مولانا مودودیؒ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"پاکستان میں کوئی طاقت اسلام کے سوا کسی اور نظریے کو نافذ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی ہے"۔

☆ علالت اور امارت سے سبکدوشی:

مولانا مودودیؒ نے اپنی پیرانہ سالی اور علالت کے باعث جماعت اسلامی کی امارت سے ۱۹۷۲ء میں سبکدوشی کا اعلان کیا تو وہ اپنے مشن پاکستان میں نفاذ اسلام اور اقامت دین کی تحریک، جماعت اسلامی کو محفوظ اور مضبوط ہاتھوں میں دے کر مطمئن تھے انہوں نے اپنی عمر کے ۷۶ برس کی آخری سانس تک اپنے مسلمان اور پاکستانی ہونے پر فخر کیا ملت اسلامیہ کا یہ بطل جلیل ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء اس دار فانی سے کوچ کر کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

☆ اختتامیہ:

برعظیم پاک و ہند میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا وجود مشیت ایزدی کا مظہر ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انہیں اس خطے میں اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی اور خدمت کے لیے چنا، ان کی سیرت و شخصیت فکر و فلسفہ اور علم و عمل نے ایسے بے شمار چراغ روشن کیے جس کی ضیاپاشی سے آج بھی ایک عالم منور ہے۔ اسلام، پاکستان اور باشندگان پاکستان کے لیے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی گرانقدر خدمات کی روشنی میں ہم انہیں بجا طور پر قومی رہنما (National

Leader)اور معمارِ قوم (Nation Bulder) قرار دے سکتے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء بمطابق ۳ رجب ۱۳۲۱ھ کو اورنگ آباد (دکن) کے مذہبی اور علمی گھرانے میں پیدا ہوئے آپ کا آبائی نسب نبی کریم ﷺ سے جاملتا ہے روحانی پیشوائی کی ایک طویل روایت اس خاندان سے وابستہ ہے آپ کے کتنے ہی اجداد سلسلہ ہائے صوفیہ کے نامور رہنما گزرے ہیں ان ہی میں ایک معروف بزرگ خواجہ قطب الدین مودود (م ۵۲۷ھ) تھے۔ مولانا مودودیؒ کے بزرگ "چشت" سے برصغیر ہندوپاک میں نویں صدی ہجری کے آخر (مطابق پندرہویں صدی عیسوی) میں منتقل ہوگئے تھے ان میں سب سے پہلے آنے والے مولانا کے ہم نام، ابوالاعلیٰ مودودیؒ (م ۹۳۵ھ) تھے۔

مولانا مودودیؒ کے والد سید احمد حسن (ولادت ۱۸۵۵ء) جو وکالت پیشہ تھے انتہائی دیندار شخص تھے ان کے تین بیٹوں میں مولانا سب سے چھوٹے تھے ابتدائی تعلیم گھر پر پانے کے بعد آپ مدرسہ فرقانیہ ہائی اسکول میں داخل ہوگئے جہاں روایتی دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید مغربی علوم بھی پڑھائے جاتے تھے۔ مولانا نے ثانوی تعلیم کامیابی سے مکمل کی آپ حیدرآباد میں انڈرگریجویٹ کے متعلم تھے کہ آپ کی رسمی تعلیم والد کی علالت اور پھر بالآخر ان کی وفات کے بعد منقطع ہوگئی تاہم مولانا مودودیؒ کو اپنا مطالعہ جاری رکھنے میں یہ امر مانع نہیں ہوا۔ عشرہ ۱۹۲۰ء کے ابتدائی سالوں تک مولانا کو اپنی مادری زبان اردو کے علاوہ عربی، فارسی اور انگریزی میں اتنا درک ہوگیا تھا اپنی پسند کے مضامین کا مطالعہ بطور خود کرنے لگے۔ مولانا کی ذہنی نشوونما بڑی حد تک ان کی اپنی سعی اور اپنے اساتذہ سے حاصل ہونے والی تحریک کا نتیجہ تھی البتہ ان کی اخلاقی پاکیزگی اور حق و صداقت سے ان کے بے پناہ لگاؤ ان کے والدین کی دینداری اور ان کی تربیت کا حصہ تھا۔

رسمی تعلیم منقطع ہوجانے کے بعد مولانا نے صحافت کو ذریعہ معاش بنایا جو ہندوستانی کے معروف اخبار جیسے تاج، مسلم اور الجمعیۃ کے مدیر رہے عملی سیاست کا آغاز ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت سے کیا ساتھ ہی تصنیف و تالیف کا بھی سلسلہ شروع ہوگیا الجہاد فی الاسلام آپ کی پہلی تصنیف ہے جو باقاعدہ کتابی شکل میں ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ (تذکرہ سید مودودیؒ مرتبین جمیل احمد رانا، سلیم منصور خالد احیائے اسلامی اور مولانا مودودیؒ پروفیسر خورشید احمد، ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری، ادارہ معارف اسلامی لاہور میں ۱۹۹۸ء ص ۱۵-۱۸)

۲۔ پاکستان کے حکمران مولانا مودودیؒ کو اپنی سیاست اور اقتدار کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے چنانچہ پاکستان کے حکمرانوں نے متعدد بار گرفتار کرکے نہ صرف جیل میں نظر بند کیا بلکہ ایک جھوٹے مقدمہ میں ملوث کرکے پھانسی کی سزا تک دی مولانا کی اسیری کا کم بیش پانچ سال بنتا ہے۔

پہلی اسیری	۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء تا ۲۸ مئی ۱۹۵۰ء	تقریباً ۲۰ ماہ

دوسری اسیری	۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء تا ۱۲ اپریل ۱۹۵۵ء	تقریباً ۲۵ ماہ
تیسری اسیری	۶ جنوری ۱۹۶۴ء تا ۲۵ دسمبر ۱۹۶۴ء	تقریباً ایک سال
چوتھی اسیری	جنوری ۱۹۶۷ء تا مارچ ۱۹۶۷ء	تقریباً ۲ ماہ

حکومت پاکستان نے جماعت اسلامی کو جنوری ۱۹۶۴ء میں خلاف قانون قرار دے دیا جبکہ ۱۹۵۳ء کو مارشل کے تحت قادیانیوں کے خلاف ایک پمفلٹ لکھنے کے جرم میں گرفتار کرکے مقدمہ چلایا گیا اور سزائے موت سنائی گئی لیکن ملک اور عالم اسلام کے شدید احتجاج اور دباؤ کے بعد سزائے موت عمر قید میں تبدیل کردی گئی بالآخر عدالتی فیصلے اور قانونی جدوجہد کے نتیجے میں آپ کی رہائی عمل میں آئی۔ (روزنامہ جسارت، سید مودودیؒ نمبر ن مذارد، اسعد گیلانی، سید مودودیؒ دعوت و تحریک، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۶ء ص ۲۷۲-۲۷۶)

۳۔ جماعت اسلامی کا قیام مولانا مودودیؒ کی تحریک پر عمل میں آیا، تاسیسی اجتماع ۲۵ تا ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں منعقد ہوا۔ اسی اجلاس میں جماعت اسلامی کی تاسیس کے اغراض و مقاصد اور دستور جماعت کی منظوری بھی دی گئی (تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے روداد جماعت اسلامی اول، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۰ء)

۴۔ مولانا مودودیؒ نے مسلمانان ہند کی اصلاح و رہنمائی کے لیے ایک علمی و سیاسی جریدہ "ترجمان القرآن" کا ۱۹۳۳ء میں حیدرآباد دکن سے اجراء کیا۔ ترجمان القرآن سے علامہ اقبالؒ پہلے متعارف اور مولانا مودودیؒ کی تحریروں سے متاثر تھے چنانچہ علامہ اقبال نے مولانا مودودیؒ کو پنجاب آنے کی دعوت دی۔ ۱۹۳۷ء میں مولانا مودودیؒ نے اپنے سفر پنجاب میں علامہ اقبال سے ملاقات بھی کی اور مستقبل میں علوم اسلامی کی نشاۃ ثانیہ کے لیے ایک خاکہ بھی تیار کیا۔ ۱۹۳۸ء میں مولانا اپنا تمام کاروبار ترک کرکے دارالاسلام پٹھان کوٹ (ضلع گورداسپور مشرقی پنجاب) منتقل ہوگئے تقسیم ہند کے بعد جب حالات بہت خراب ہوگئے اور احباب نے اصرار کیا تو قیام پاکستان کے چند روز بعد ۲۹ اگست ۱۹۴۷ء کو دارالاسلام سے ہجرت کرکے لاہور آگئے پھر یہیں مستقل قیام کیا اور ترجمان القرآن کا اجراء بھی کیا (تذکرہ سید مودودیؒ ص ۲۷۸-۲۷۹)

۵۔ قریشی، اشتیاق حسین، ڈاکٹر، جدوجہد پاکستان، مترجم، ہلال احمد زبیری، شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ کراچی ۱۹۹۵ء ص ۱۰۵۔

۶۔ مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، تحریک آزادی ہند اور مسلمان، اسلامک پبلشرز لاہور، ۱۹۹۱ء

۷۔ ایضاً ص ۳۲۶

۸۔ ایضاً ص ۳۱۷-۳۱۸

۹۔ ایضاً ص ۱۷

۱۰۔ راجا، مصدق حسین، ڈاکٹر، سید مودودیؒ۔ مرد مومن بصورت حر مستقل، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، ۱۹۹۶ء ص ۱۶

۱۱۔ ایضاً ص ۱۴-۱۵

۱۲۔ ایضاً ص ۱۴

۱۳۔ گیلانی، سید اسعد، ڈاکٹر، سید مودودیؒ، بچپن، جوانی، بڑھاپا، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۸۷ء ص ۵۳۔۵۴

۱۴۔ حجازی، اختر، دارالاسلام، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۹۵ء ص ۴۳۔

۱۵۔ عبد، چودھری عبدالرحمن، مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء ص ۱۴۸۔

۱۶۔ تذکرہ سید مودودیؒ ج ۲ ص ۳۶۲

۱۷۔ دارالاسلام، ص ۷

۱۸۔ سید مودودیؒ بچپن، جوانی، بڑھاپا، ص ۵۷

۱۹۔ ایضاً ص ۵۸

۲۰۔ مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، جماعت اسلامی کے ۲۹ سال، شعبہ نشر و اشاعت، جماعت اسلامی پاکستان ۱۹۷۰ء ص ۴۸

۲۱۔ ایضاً ص ۵۳۔۵۴

۲۲۔ ایضاً ص ۷۶۔۷۷

۲۳۔ آباد شاہ پوری، تاریخ جماعت اسلامی، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۸۹ء ص ۵۰۷

۲۴۔ سید مودودیؒ بچپن، جوانی، بڑھاپا، ص ۵۹

۲۵۔ تذکرہ سید مودودیؒ، ج اول، ص ۳۶۲

۲۶۔ ایضاً ص ۶۰

۲۷۔ قریشی، اشتیاق حسین، ڈاکٹر، جدوجہد پاکستان، مترجم ہلال احمد زبیری، شعبہ تصنیف و تالیف کراچی یونیورسٹی کراچی ۱۹۹۵ء

۲۸۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ہمارا، سید عارف، کشمیر تاریخ کے گرداب میں، اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی ۱۹۹۴ء اور صولت، ثروت، مولانا مودودیؒ کی تقریریں، ج دوم، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۸ء

۲۹۔ تذکرہ سید مودودیؒ، ج ۲ ص ۵۷۹

۳۰۔ مولانا مودودیؒ کی تقریریں، ص ۱۱

۳۱۔ ایضاً ص ۱۳

۳۲۔ ایضاً ص ۱۳۔۱۶

۳۳۔ ایضاً ص ۱۶۔۱۷

۳۴۔ مودودیؒ، ابوالاعلیٰ سید، اسلامی ریاست، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۸ء ص ۶۸ ۔ ۶۷

۳۵۔ القرآن سورہ بنی اسرائیل ۸۰

۳۶۔ اسلامی ریاست، ص ۱۶۱

۳۷۔ ایضاً ص ۶۴

۳۸۔ ایضاً ص ۹۱

۳۹۔ ایضاً ص ۹۲

۴۰۔ مودودیؒ، ابوالاعلیٰ سید، تصریحات، البدر پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۱ء ص ۳۳۵

۴۱۔ اسلامی ریاست، ص ۱۳۰

۴۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ اسلامی ریاست، ص ۱۳۰۔۱۳۱

۴۳۔ تصریحات، ص ۱۶۰، ہم یہاں یہ بات واضح کردیں کہ تصریحات سے مولانا کے سیاسی افکار سے متعلق جو آراء پیش کی ہیں ان کی نوعیت سوال جواب کی ہے۔

۴۴۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تصریحات، ص ۱۶۱۔۱۶۲

۴۵۔ تصریحات، ص ۱۶۳

۴۶۔ ایضاً ص ۱۶۳۔۱۶۴

۴۷۔ ایضاً ص ۲۳۷

۴۸۔ اسلامی ریاست، ص ۵۵۳۔۵۵۴

۴۹۔ ایضاً ص ۵۵۴

۵۰۔ ایضاً ص ۵۵۴ تا ۵۷۰

۵۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اسلامی ریاست، ص ۶۴۹ تا ۶۵۴

۵۲۔ ایضاً ص ۶۷۰ تا ۶۷۸

۵۳۔ تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل، ص

۵۴۔ تذکرہ سید مودودیؒ، ج ۳ ص ۱۴۷۔۱۴۸

۵۵۔ پارلیمانی مطالبہ ایک قرارداد کی صورت میں سامنے آیا جو ان الفاظ پر مشتمل تھا:

''چونکہ پاکستان کے باشندوں کی عظیم اکثریت اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتی ہے اور چونکہ پاکستان کی آزادی کے لیے مسلمانوں کی ساری جدوجہد اور قربانیاں صرف اسی خاطر تھیں کہ وہ ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرسکیں جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔ لہٰذا اب قیام پاکستان کے بعد یہ پاکستانی مسلمان دستور ساز اسمبلی سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس بات کا اعلان کرے کہ:

(۱) پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ کے لیے ہے اور حکومت پاکستان کی کوئی حیثیت اس کے سوا نہیں ہے

کہ وہ اپنے بادشاہ کی مرضی اس کے ملک میں پوری کرے۔

(۲) پاکستان کا بنیادی قانون اسلامی شریعت ہے۔

(۳) وہ تمام قوانین جو اسلامی شریعت کے خلاف جاری رہے ہیں منسوخ کیے جائیں گے اور آئندہ اب کوئی قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو شریعت کے خلاف ہو۔

(۴) حکومت پاکستان اپنے اختیار ان حدود کے اندر استعمال کرے گی جو شریعت نے مقرر کردی ہیں۔

(مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ص ۴۲۰ _ ۴۲۱)

۵۶_ایضاً ص ۴۱۸

۵۷_ایضاً ص۴۲۱_۴۲۲

۵۸_ایضاً ص۴۲۲

۵۹_ڈاکٹر صفدر محمود، پاکستان تاریخ و سیاست، جنگ پبلشرز ۱۹۹۲ء ص ۴۴

۶۰_"ریلیجن اینڈ پالیٹکس ان پاکستان" کے مصنف لیونارڈ بائنڈر نے قرارداد مقاصد کی منظوری میں مولانا مودودیؒ کے موثر کردار اور جماعت اسلامی کے بارے میں لکھا کہ علمائے کرام کو کچھ کچھ معلوم ہو گیا کہ اقتدار اعلیٰ قانون کا ماخذ ہوتا ہے اور یہ کہ اس کی مرضی کو قانون کہا جاتا ہے مغربی اصطلاح کے اس مفہوم کو عام کرنے کا سہرا مولانا مودودیؒ کے سر ہے۔جنھوں نے اپنے پارلیمانی مطالعے کے آخر تک سے ریاست کے اقتدار اعلیٰ پر پابندی لگادی تھی کہ کتاب و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جاسکے گا۔(مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ص ۴۲۰)

۶۱_ایضاً ص ۴۲۰_۴۲۱

۶۲_پاکستانی تاریخ و سیاست ص ۴۵ _ ۴۶

۶۳_ملاحظہ ہو موچی دروازہ جلسہ منعقدہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں مولانا مودودیؒ کی تقریر کا مکمل متن اور سوال جواب۔

(مولانا مودودیؒ کی تقریریں ج ۲ ص ۱۲۲ تا ۲۰۴)

۶۴_ایضاً ص۱۸۴

۶۵_مفکر اسلام، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ص ۴۲۷ _ ۴۲۸ علماء کا اجتماع مولانا احتشام الحق تھانوی کی دعوت پر منعقد ہوا۔

۶۶_ایضاً ص ۴۲۸

۶۷_ایضاً ص ۴۵۳

۶۸_ایضاً ص ۴۵۳

۶۹_مولانا مودودیؒ کی تقریریں ص ۱۶۷

۷۰_مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ص ۴۵۸ _ ۴۵۹

۷۱_جماعت اسلامی کے ۲۹ سال ص ۶۱

۷۲_تذکرہ سید مودودیؒ ج ۳ ص ۵۴

۷۳_ایضاً ص ۵۳

۷۴_ایضاً ص ۵۵

۷۵_پاکستان تاریخ و سیاست ص ۵۶

۷۶_مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ص ۲۶۸_۲۶۹

۷۷_ایضاً ص ۴۸۶

۷۸_۱۹۶۲ء کے دستور میں حق بالغ رائے دہی سلب کرکے بنیادی جمہوریت کا نظام متعارف کرایا گیا اور پارلیمانی نظام کی جگہ صدارتی نظام نافذ کردیا گیا۔ آئین میں صدر کو آمرانہ اختیارات دے کر مختار کل بنادیا گیا اسے اسمبلی تحلیل کرنے، وزراء کو برطرف کرنے کا اختیار سونپ دیا گیا اس آئین نے ایک سیاسی آمر کو جنم دیا(پاکستان تاریخ و سیاست ص ۶۶)

۷۹_مفکر اسلام، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ص ۳۱۱

۸۰_ایضاً ص ۳۴۵

۸۱_ایضاً ص ۳۴۲

۸۲_ایضاً ص ۳۴۳

۸۳_ایضاً ص ۳۵۱

۸۴_ایضاً ص ۳۸۹

۸۴_ایضاً ص ۳۶۷

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۲، شمارہ ۱۸ اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

مولانا مفتی محمود کی تفسیری خدمات

ڈاکٹر عبدالعلی اچکزئی

Mufti Mehmood was a prominent political & religious visionary of 20th century having a deep wisdom in Quranic knowledge, Hadith and Fiqh. He had a strange command over the solutions of most complicated problems in Fiqh & Ifta. He trained a large number of students in religious fields of Tafseer, Hadith & Fiqh, whom brought forward his work by compilations in Book form.

Mufti Mehmood was a political leader, a visionary thinker and a traditionalist of high caliber. Though due consideration has not been given to his scholarly works however now his followers are bringing his contribution in written form. Tafseer-e-Mehmood is also one of his legendary piece of work in the field of Quranic Commentaries. It

has been recently published. The said work is comprised of his lectures reproduced by his students and a group of scholars.

In the said commentary, the Quranic translation of Maulana Ahmed Ali Lahori has been used and a comprehensives preface has also been incorporated. As the Fiqh is the special field of the author therefore in his Quranic Commentary he has also discussed so many issues of Fiqh, particularly he has enlightened contemporary issues with a deep vision and wisdom. He has also fully analyzed the present laws of the country in the light of Quran and Sunnah.

His commentary is very rich by his Quranic arguments against false concepts of various religions and proves Islam as final and true code of life.

مختصر حالات زندگی:۔ مجیب الرحمٰن شامی مولانا مفتی محمودؒ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پیشانی کشادہ، مطلع انوار، آنکھیں روشن، زندہ و بیدار، ابھرے ہوئے مسکراتے رخسار، گندمی رنگ میں سرخی کے آثار، سر کے بال پٹے دار، داڑھی پھیلی ہوئی باوقار، سیاہی پر سپیدی ژالہ بار، شانے چوڑے اور مضبوط، مردانہ وار، ناک ستواں، قد میانہ، جسم گٹھا ایک شجر سایہ دار، پرسکون جیسے دامن کوہسار، لباس سے سادگی آشکار، کندھوں پر مستقل رومال کر جسد خاکی کا حاشیہ بردار، دم گفتگو دلیل کی گفتار، دم جستجو فرض کی پکار... میدان سیاست کا شہسوار اہل دین کے لیے سرمایہ افتخار، اہل دل کے لیے وجہ قرار، دیوبند کے گلے کا ہار، پاکستان پر سو جان سے نثار، افغانستان پر اشک بار، جہادی للکار، (اس سے) لرزہ براندام اشتراکی و سرمایہ دار، ہر جنس بازار، وہ ایک کلمہ پائیدار، باوقار، باکردار، حامد شب زندہ دار، روایات

اسلاف کا نگہ دار ،رحمت پروردگار"(۱)

مولانا مفتی محمودؒ ۱۹۱۹ء میں صوبہ سرحد کے شہر ڈیرہ اسمٰعیل خان کے مقام پنیالہ میں پیدا ہوئے۔آپ کے خاندان کا تعلق افغانوں کے مشہور قبیلہ ناصر سے ہے ، والد کا نام خلیفہ محمد صدیق ہے ،جو عالم ہونے کے ساتھ ساتھ طریقت کے سلاسل اربعہ میں خلیفہ مجاز تھے ،ذکر وتلقین بطریقہ نقشبندیہ مجددیہ فرمایا کرتے تھے ،والد موصوف افغانستان سے یہاں ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان میں پنیالہ کے مقام پر آکر مستقل سکونت اختیار کر گئے تھے ۔مفتی محمود نے ناظرہ قرآن حکیم اپنے والد صاحب سے پڑھا ،فارسی اورفقہ کی ابتدائی کتابیں اپنے والد صاحب اورمولوی شیر محمد سے پڑھیں ۔آپ نے ۱۹۳۳ء میں پنجاب بورڈ سے مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول پنیالہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔سکول کی تعلیم سے فراغت کے بعد آپ کے والد صاحب نے آپ کو حضرت سید عبدالعزیز شاہ کے پاس ابا خیل بھیجا ،شاہ صاحب نے آپ کو صرف ونحو ،فقہ واصول فقہ اورعلم منطق کے ابتدائی رسائل پڑھائے۔ ۱۹۳۶ء میں آپ علوم اسلامیہ کی تکمیل کے لئے برصغیر کی سب سے بڑی اسلامی درسگاہ دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے مگر چند ماہ گزارنے کے بعد آپ کو مرادآباد کے شاہی مدرسہ میں داخل کردیا گیا ،کیونکہ آپ دارالعلوم دیوبند کو چھوڑنا نہ چاہتے تھے مگر والد صاحب کے حکم پر آپ کو وہاں سے جانا پڑا ،مراد آباد کے شاہی مدرسے میں مفتی صاحب چھ سال تک زیر تعلیم رہے ،اس کے بعد آپ مدرسہ اسلامیہ امروہہ میں داخلہ لے کر زیر تعلیم رہے ،اس طرح آپ نے علم فقہ ،معانی ،تاریخ ،فلسفہ ،منطق ،علم کلام ، ہیئت، ہندسہ، حساب ،فقہ ،حدیث وتفسیر اور قرأت سبعہ وعشرہ کے تمام علوم مکمل کرلئے ۔آپ کے اساتذہ میں آپ کے والد ماجد کے علاوہ مولوی شیر محمد پنیالوی ،مولانا عجب نور ،مولانا سید محمد میاں ،مولانا فخرالدین اورمولانا حافظ عبدالرحمٰن امروہوی وغیرہ شامل ہیں۔مفتی محمود نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ (جو آپ کے ابتدائی استاد تھے) کے ہاتھ پر بیعت کی تھی ،شاہ صاحب نے سلاسل اربعہ میں انہیں مجاز فرمایا تھا۔

سیاسی سفر کا آغاز آپ نے اس طرح کیا تھا کہ ۱۹۴۳ء میں آپ جمعیت علماء ہند کے کونسلر مقرر ہوئے اور تقسیم ملک کے بعد علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی جماعت جمعیت علماء اسلام کے

ممبر بنے۔۱۹۵۵ء میں آپ مدرسہ قاسم العلوم ملتان سے منسلک ہوئے اور کافی عرصے تک آپ وہاں پڑھاتے رہے ۔۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں آپ قومی اسمبلی کے ممبر بنے ،جبکہ ۱۹۷۲ء میں آپ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے۔وزارت اعلیٰ کی یہ مدت صرف چند مہینے تک رہی ۔۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت اور اس کے بعد ۱۹۷۷ء میں تحریک نظام مصطفےٰ میں آپ نے بھرپور کردار ادا کیا۔خاص کر ۱۹۷۴ء کی تحریک میں آپ نے قائدانہ کردار کیا ،قومی اسمبلی میں آپ ہی نے امت مسلمہ کے ترجمان اوروکیل کی حیثیت سے مرزائیوں کے دونوں گروہوں (قادیانی ،لاہوری) پر جرح کرکے قومی اسمبلی سے ان کے کفر کا فیصلہ حاصل کیا اوران کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوایا۔(۲)مولانا مفتی محمودؒ نے اگر ایک طرف قومی اسمبلی کے ایوان میں اس فتنہ عظیم کے خلاف امت مسلمہ کے ترجمان اوروکیل کی حیثیت سے بھرپور کردار ادا کیا تو دوسری طرف ملک بھر میں اس تحریک کو کامیابی کے ساتھ چلانے اوراس سلسلے میں عوامی بیداری کی مہم میں بھی آپ نے موثر کردار ادا کیا ،جیسا کہ خواجہ خان محمدؒ سابق امیر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت لکھتے ہیں :

"تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء کی کامیابی ان کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے ،اس تحریک میں بھی بلاشبہ دوسرے تمام مکاتب فکر کے علماء ،طلباء اورکارکن شامل تھے ،ان تمام مجاہدین نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کی قیادت میں بڑی بے جگری سے ختم نبوت کی جنگ لڑی لیکن پارلیمانی محاذ پر دشمنان ختم نبوت کی شکست مفتی صاحب کی بے پناہ علمی ،سیاسی اورفکری کوششوں کا نتیجہ تھی ،صرف یہی نہیں کہ وہ قومی اسمبلی میں قادیانیوں سے آئینی جنگ اور قادیانی جماعت کے سربراہ سے علمی مباحثوں میں مصروف رہے ،قومی محاذ پر بھی وہ تقریر وخطابت کے ذریعہ ملت اسلامیہ کے دلوں کو گرماتے اورجذبوں کو بیدار کرتے رہے ،اس سلسلے میں ملک بھر میں ہونے والے تمام بڑے اجلاسوں میں وہ بنفس نفیس شریک ہوئے" (۳)

مولانا مفتی محمود کا انتقال ۱۹۸۰ء کو کراچی میں ہوا اور رحلت بھی اس حال میں فرمائی کہ حج پر جانے کا پروگرام تھا ، مدرسہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی میں علماء کی مجلس میں تشریف فرما تھے اورمسئلہ زکوٰۃ پر خالص مذہبی اورعلمی گفتگو ہو رہی تھی کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولانا مفتی محمود کی علم تفسیر وحدیث اورفقہ وافتاء پر گہری نظر تھی ،آپ پیچیدہ سے پیچیدہ

مسائل کو حل کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے ،ایک مدرس ومعلم کی حیثیت سے ہزاروں طلباء کوتفسیر وحدیث اورفقہ کی تعلیم دی ،جس کو ان کے شاگردوں نے آگے بڑھایا مفتی صاحب کے یوں تو ہزاروں شاگرد ہیں مگر ان میں چند مشہور شاگردوں میں مولانا محمد موسیٰ خان روحانی بازی مولانا سید حامد میاں مولانا محمد رمضان مولانا نورمحمد اور قاری محمد حنیف وغیرہ شامل ہیں ۔مفتی صاحب کو اگر چہ کوئی مصروفیات کے باعث تصنیف وتالیف کا زیادہ موقعہ نہ مل سکا مگر پھر بھی آپ نے بعض تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جن کی افادیت مسلمہ ہے ،ان میں (۱) زبدۃ المقال فی رؤیۃ الھلال (۲) المنتی الفادیانی من ھو ؟تو آپ کی حیات میں طبع ہوچکی تھیں اور (۳) التسھیل لاحکام التنزیل (۴) زادالمنتھیٰ شرح سنن الترمذی ،آپ کی وفات کے بعد زیورطبع سے آراستہ ہوئیں ،یہ چاروں تصانیف فصیح عربی میں ہیں،جبکہ مزید دوتصانیف یعنی فتاویٰ محمود (جس کی تادم تحریر گیارہ جلدیں شائع ہوچکی ہیں) اورتفسیر محمود حال ہی میں شائع ہوئی ہیں ۔(۴)

حضرت مولانامفتی محمودؒ ایک سیاسی رہنما ،عظیم مفکر ومدبر اور بڑے پایہ کے فقیہ ومحدث تھے ۔آپ کے کارناموں ،علم وعمل ،بحث وتحقیق پر جس طرح کام ہونا چاہیے تھا ،اس انداز پر نہیں ہوا ،تاہم اب آپ کے بعض منتسبین ان کے علم ومعارف کے مدفون خزانے منصۂ شہود پر لانے کی کوشش کررہے ہیں ۔سب سے پہلے آپ کے دارالافتاء کے کارناموں کی ترتیب وتدوین کا عمل جاری ہے اور اس کے بہت سے اجزاء ترتیب وتہذیب اورنظم وتدوین کے مراحل سے گزر کر شائع ہو چکے ہیں ۔حال ہی میں ان کے تفسیری کمالات تفسیر محمود کے عنوان سے منظر عام پر آچکے ہیں اور امید ہے کہ دیگر کارنامے بھی جلد شائع ہونا شروع ہو جائیں گے ۔

تفسیری خدمات :۔اللہ تعالیٰ نے مولانامفتی محمودؒ کو دیگرعلوم کے علاوہ تفسیر قرآن حکیم کا خاص ذوق اورخصوصی ملکہ عطا فرمایا تھا ،آپ کے فقہی استدلالات میں جابجا قرآنی آیات اوران کی تفسیر کے حوالے ملتے ہیں ،عام بیان میں بھی آپ قرآن حکیم کی آیات اوراس کے مفہوم کو نہایت دلنشین انداز میں بیان فرماتے تھے ،آپ کی تفسیر وحدیث سے خصوصی شغف کی بناپر مولانا ایوب جان بنوری لکھتے ہیں :

"مفتی محمود علم کے حوالے سے بہت بڑے آدمی تھے ،ان کوخدا نے مجتہدانہ بصیرت عطا فرمائی تھی ،وہ بیک وقت محدث مفسر مفتی اورقومی رہنما تھے ... بحیثیت مفسر اورشیخ الحدیث ان کی ٹکر کے بہت کم لوگ دیکھنے میں آئے ہیں"(۵)

مولانامفتی محمودؒ نے ۱۹۷۶ء میں حضرت مولانا احمد علی لاہوری کی علمی جولانگاہ شیرانوالہ گیٹ لاہور میں اکابر علماء کی خواہش اور جانشین حضرت لاہوریؒ مولاناعبیداللہ انورؒ کے اصرارپر دورہ تفسیر پڑھانے کی ذمہ داری قبول فرمائی جیساکہ حضرت مولاناعبیداللہ انورؒ اس حوالے سے اپنے تاثرات اس طرح بیان کرتے ہیں :

"ہمارے حضرت مولانااحمدعلی لاہوریؒ علوم اسلامیہ کے فارغ التحصیل علماء اورمنتہی طلباء کورمضان شریف سے ذوالحجہ تک قرآن کریم کادورہ پڑھاتے تھے ،تقسیم ملک سے قبل دارالعلوم دیوبند سمیت تمام بڑے بڑے مدارس کے ہونہار طلباء اس درس میں شریک ہوتے تھے ،الحمدللہ یہ سلسلہ اب تک قائم ہے ،لیکن وقت میں بوجوہ تبدیلی کردی گئی ہے ،چندسال پہلے ہم نے مفتی صاحب مرحوم سے اس جماعت کوپڑھانے کے لیے کہا بھئوصاحب کادوراقتدارتھا اورحالات سخت دگرگوں ،لیکن انہوں نے کمال شفقت سے اس کومنظور کرلیا،اس مقصدکی خاطر جب وہ لاہورتشریف لائے تومدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ لاہورکی عمارت میں قیام فرمایا۔مدرسے کی عظیم الشان لائبریری کھلوائی اورقرآن کریم کی جتنی قدیم تفاسیراس میں تھیں ،وہ نکلوائیں۔اس کے علاوہ جامعہ مدنیہ کے کتب خانے سے بعض تفاسیر منگوائیں ،کچھ دوستوں اورعزیزوں سے ذاتی کتابیں حاصل کیں ،یہاں تک کہ ان کی چارپائی کے نزدیک جوبڑی میز تھی ،وہ تفاسیر سے بھرگئی ،ان میں عربی اوراردوکے علاوہ ایسے لوگوں کی تفاسیر بھی تھیں جوعام طورپر دینی اورعلمی حلقوں میں پسندیدہ نہیں سمجھی جاتے ،قریباً چھ گھنٹے روزانہ اس طرح پڑھاتے کہ نصف وقت کے بعد چندلمحوں کے لیے وقفہ کرتے اوراس وقفے میں چائے کی ایک پیالی نوش جاں فرماتے (رمضان کی آمد کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا) اس جماعت میں الگ الگ ڈیڑھ صدطلباء شریک ہوتے ،چونکہ آپ کے زیردرس زیادہ تر حدیث اورفقہ کے اسباق رہے تھے۔اس لیے حیرانی ہوئی کہ پہلی بارتفسیری اسباق کس شان سے پڑھائے جارہے ہیں ، اسلاف کی متین

راہوں پر چل کر قرآنی نکات کا بیان اور جدید افکار پر ٹھوس اور متین تنقید انہی کا کام تھا" (۶)

حضرت مفتی محمود کے دورۂ تفسیر میں شریک ہونے والے متعدد اہل علم نے اس موقع پر ان کے تفسیری نکات اور فوائد کو قلم بند کیا۔ ان علماء نے قلم وقرطاس کے ذریعے کچھ خزینے محفوظ کر لئے جو دفینوں کی شکل میں محفوظ چلے آرہے تھے۔ مفتی محمد جمیل شہید نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ان دفینوں کو سفینوں میں منتقل کر کے امت مسلمہ کو ان سے مستفید ہونے کا موقع دیا جائے۔ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ مولانا محمد یوسف خان کی خدمت میں حاضر ہوئے جن کے پاس یہ علمی خزانہ محفوظ تھا، یہ امانی حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اس کام کی ذمہ داری محمد ریاض درانی کے سپرد کی، جنہوں نے مولانا فضل الرحمٰن کی مشاورت سے اس کام کو شروع کیا۔ حضرت مفتی محمد جمیل نے اس کام کی ترتیب وتشکیل فرمائی۔ حضرت مولانا محمد یوسف خان کو اس کا نگران اور جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے فاضل حضرت مولانا عبدالرحمٰن کو اس کام کی ترتیب وتسوید پر مامور فرمایا گیا، جنہوں نے نہایت محنت ودیدہ ریزی سے اس علمی دستاویز کو صاف کیا، اسے امالی سے تفسیری انداز میں منتقل فرمایا، جہاں تشنگی تھی، اس کی تکمیل فرمائی۔ قرآن حکیم کے ترجمے کے لئے امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے ترجمے کو منتخب کیا گیا۔

زبان کی نوک پلک کی درستگی اور نظر ثانی دینی حلقے کے قدیم کارکن پروفیسر امجد علی شاکر پرنسپل گورنمنٹ کالج قصور کے حصے میں آئی، یوں تفسیر محمود مرتب ہو کر کمپوزنگ کے مرحلے میں داخل ہوگئی۔ جب تفسیر محمود کی کمپوزنگ ہوگئی تو اس کی مزید اصلاح وترتیب کے لئے حضرت مولانا عبدالرحمٰن، مولانا ریاض درانی اور پروفیسر امجد علی شاکر نے اس پر نظر ثانی کی اور ان سب کے بعد اس جماعت نے مکرر حضرت مفتی محمود کے شاگرد رشید حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان مدیر جامعہ مفتاح العلوم کوجرانوالہ کی سربراہی میں اس پر نظر ثانی کی۔ اسی اثناء میں جانشین مفتی محمود حضرت مولانا فضل الرحمٰن کو کہیں سے اس سلسلہ کی ایک دوسری امالی دریافت ہوگئی، انہوں نے ان حضرات سے فرمائش کی کہ اس سے بھی استفادہ کیا جائے۔ چنانچہ ان حضرات نے ان دونوں مخطوطوں کا تقابل کیا اور جو چیزیں حضرت مولانا محمد یوسف خان کی امالی سے زائد ان امالی

میں موجود تھیں، ان کو حسب موقع درج کیا، یوں تفسیر محمود نہایت حزم واحتیاط کی چھلنی سے چھن کر ایک مکمل وجامع مگر مختصر تفسیر کی شکل میں تیار ہوگئی اور اس طرح پہلی دفعہ جولائی ۲۰۰۶ء میں تین جلدوں میں جمعیت پبلیکیشنز لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ (۷)

مذکورہ تفسیر کی سند اس طرح بیان کی گئی ہے۔ عن الاستاذ مولانا مفتی محمود عن الشیخ مولانا سید فخر الدین مراد آبادی عن الشیخ الهند مولانا محمود حسن عن الشیخ مولانا محمد قاسم نانوتوی، وعن الشیخ مولانا رشید احمد جنجوهی، عن الشیخ شاه عبدالغنی مجددی وعن الشیخ مولانا احمد علی سهارنپوری، عن الشیخ الشاه محمد اسحق دهلوی عن الشیخ شاه عبدالقادر محدث دهلوی عن الشیخ استاذ الهند شاه عبدالعزیز محدث دهلوی عن الشیخ الامام الشاه ولی الله دهلوی۔ (۸)

تفسیر محمود میں درج ذیل خصوصیات پائی جاتی ہے۔

(۱) قرآن حکیم کا مکمل ترجمہ: تفسیر میں قرآن مجید کا مکمل ترجمہ دیا گیا ہے اور یہ کوئی نیا ترجمہ نہیں، بلکہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ کے ترجمہ کو منتخب کیا گیا ہے۔

(۲) مقدمہ تفسیر: تفسیر کے شروع میں "تقدیم" کے عنوان سے ایک مفید مقدمہ دیا گیا ہے، جس میں اصول وتاریخ تفسیر سے متعلق بعض اہم اور مفید عنوانات کو زیر بحث لایا گیا ہے جن میں بعض اہم عنوانات درج ذیل ہیں۔

فضیلت قرآن اور فضیلت تعلیم وتعلم قرآن: اس عنوان کے تحت آٹھ احادیث کو درج کیا ہے۔

نزول قرآن: اس عنوان کے تحت نزول قرآن کا آغاز، مقام آغاز وحی، زمانہ نزول وحی، ترتیب نزول قرآن، مکی اور مدنی سورتوں کی تفصیل درج ہے۔

جمع وتدوین قرآن: یہاں پر فاضل مؤلف نے جمع وتدوین قرآن کی کیفیت، جمع وحفاظت قرآن کے چاروں مراحل پر روشنی ڈالی ہے۔

خط وحرکات قرآن: اس عنوان کے تحت قرآن حکیم پر خط واعراب لگانے کی تفصیل فراہم کی گئی ہے۔

مسئلہ سبعہ احرف: مذکورہ عنوان کے تحت سبعہ احرف کی تفسیر وتوجیہ میں مختلف اقوال پیش کئے گئے ہیں۔

الفرق بین التفسیر والتاویل : اس عنوان کے تحت موصوف نے تفسیر کی لغوی واصطلاحی تعریف تفسیر بالرائے کا مفہوم ،اقسام تفسیر بالرائے کو واضح کیا ہے۔

علوم القرآن : اس عنوان کے تحت علوم خمسہ یعنی علم الاحکام ،علم المخاصمہ ،علم التذکیر بالاء اللہ،علم تذکیر بایام اللہ اورعلم تذکیر بالموت ومابعدہ کوتفصیل سے بیان کیا ہے۔

ناسخ ومنسوخ : ناسخ ومنسوخ سے کیامراد ہے؟ نسخ کی کتنی قسمیں ہیں ،مذکورہ سولات کے جوابات دینے کے ساتھ ساتھ ابن العربی کے قول کے مطابق جو ہیں آیات منسوخ ہیں ،ان کی تفصیل درج کی ہے۔

اسماء قرآن : اس عنوان کے تحت قرآن کے چار مشہور اسماء یعنی القرآن ،الفرقان،الکتاب اورالذکر کے مفہوم کو بیان کیا ہے۔

(۳)رموز ودلائل کی توضیح: مفتی محمود کی نگاہ بہت باریک بین ہے ،آپ آیات میں پوشیدہ رموز ودلائل کو سامنے لاکر قرآن مجید کی فصاحت وبلاغت کو واضح کرتے ہیں ، مثلاً سورت آل عمران کی آیت زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ(۹) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''نساء میں دو فتنے اور اولاد میں ایک فتنہ ہے۔عورتوں میں ایک فتنہ معاشرتی ہے اور دوسرا مالی ہے۔معاشرتی فتنہ عورت میں یہ ہے کہ شوہر کو قطع رحمی پر ابھارتی اور برانگیختہ کرتی رہتی ہے ،کہ تمہاری والدہ نے یہ بات کہی ہے تمہارے والد نے یہ بات کہی ہے۔نتیجتاً گھر میں معاشرت خراب ہوتی اور فتنہ برپا ہوجاتا ہے۔شادی کے بعد بہن بھائیوں اور والدین سے اچھا سلوک تقریباً ختم ہو جاتا ہے۔پھر الگ مکان اور رہن سہن کا مطالبہ کرتی ہے ،وغیرہ وغیرہ۔

دوسری بات یہ ہے کہ نان ونفقہ چونکہ شوہر کے ذمہ واجب ہے تو وہ غریب مجبور ہوتا ہے کسب حرام پر۔وہ یہ نہیں دیکھتا کہ میں حلال کمارہا ہوں یا حرام ،کتنے لوگوں کو اذیتیں دے دے کر وہ اس کے جائز وناجائز مطالبوں کو پورا کرتا ہے ،اس کی عاقبت تباہ ہوجاتی ہے،یہ مالی

فتنہ ہے۔اولاد میں صرف مالی فتنہ ہے ،معاشرتی فتنہ نہیں ہے،لہذا نساء کا فتنہ اشد واضر ہے اولاد کے مقابلے میں۔(۱۰)

(۴)مفردات کی تشریح: آپ قرآن مجید کے مفردات کی تشریح وتفسیر فرماتے ہیں اور اس سلسلے میں بہت سے نئے امور اور نئے نکات بیان فرماتے ہیں ،مثلاً یہود کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہودی کو یہودی کیوں کہتے ہیں ؟ ھاد یھود ،اجوف واوی ہے ،مثل قال یقول یعنی تاب یتوب ،ای رجع ،انا ھدنا الیک ای تبنا الیک یعنی تاب یعنی ہاد یہود ،رجوع کرنے کے معنی میں ہے(۱۱)اسی طرح مباہلہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مباہلہ ،بھل سے ہے ،بھل یبھل باب فتح یفتح سے ہے ،بھلہ ای لعنہ ایک تو یہ لفظ لعنت کے معنی میں آتا ہے اوردوسرا دعاء میں عاجزی وانکساری کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔(۱۲)

(۵) علم کلام ومناظرہ: یہ تفسیر آپ کے متکلمانہ ذہن کی عکاس بھی ہے ،آپ قرآنی دلائل وحکم کی بہت اچھی تفسیر کرتے ہیں ،بہت سے امور پر باطل مذاہب اور غلط خیالات کا خوبصورتی سے رد فرماتے ہیں اور مذہب حقہ کی حقانیت واضح فرماتے ہیں ۔مثلاً عقیدہ ختم نبوت سے متعلق مرزائیوں کا ایک شبہ نقل کرتے ہوئے اس کا ازالہ اس طرح کرتے ہیں:

''مرزائی عام طور پر ایک شبہ پیش کرتے ہیں کہ اگر کسی شیخ الحدیث کو خاتم المحدثین کہا جائے یا کسی متکلم کو خاتم المتکلمین کہا جائے تو کیا اب کسی اور محدث اور متکلم کا پایا جانا ممنوع ہے ؟لہذا جیسے یہ ممنوع نہیں ہیں ،اسی طرح خاتم النبیین کے بعد کسی اور نبی کا ہونا بھی ممنوع نہیں ہے،لیکن جواب اس شبہ کا ایک تو یہ ہے کہ انسان کے علم کو اللہ کے علم پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے یعنی انسان اگر کسی کو خاتم المحدثین یا خاتم المتکلمین وغیرہ کہتا ہے تو فی الحال اس کے علم میں یہی شخص خاتم المحدثین یا خاتم المتکلمین ہوتا ہے ،لیکن انسان کا علم قلیل اور محدود ہے لہذا کل کو کسی اور جگہ کوئی اچھا اور ماہر شیخ الحدیث یا متکلم پایا جائے تو ایسا ہونا ممکن ہے ،لیکن اللہ تعالیٰ کا علم تو کائنات کے ذرے

ذرے کو محیط ہے ،اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو خاتم النبیین فرمایا اور اس کے بعد بھی نبوت ملنے اور دینے کا سلسلہ جاری رہا تو کذب فی الکلام لازم آئے گا ۔دوسرا جواب یہ ہے کہ محدث یا متکلم ہونا ،ڈاکٹر یا انجینیر ہونا یہ سب باتیں کسب سے متعلق ہیں ،ان کے متعلق اگر کسی شخص کے لئے لفظ خاتم استعمال کیا جائے تو وہ مبالغہ پر محمول ہوگا ،اس سے ماعدا کی نفی لازم نہیں آئے گی ،جبکہ نبوت وہبی ہے ،اس کا کسب اور محنت سے کوئی تعلق نہیں ہے لہذا لفظ خاتم النبیین معنی حقیقی پر محمول ہوگا اور سیاق وسباق کا تقاضا بھی یہی ہے"۔(۱۳)

(۶)ربط آیات:۔ ربط آیات کے سلسلہ میں حضرت مولانا شیخ حسین علی اور حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے تفسیری انداز معروف اور متعارف ہیں ۔مولانا مفتی محمود نے ربط آیات پر بھی کلام فرمایا ہے ،لیکن آپ ہر جگہ ربط کو لازم نہیں پکڑتے ،ربط ویسے بھی ذوقی ہے اور مفسر کا اجتہاد ہوتا ہے ،اسے منصوص نہیں کہا جا سکتا ۔حضرت مفتی صاحب نے جہاں جہاں فطری ربط محسوس کیا ہے ،وہاں وہاں ربط بیان فرمایا ہے ،البتہ بتکلف ربط بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ،سورۃ الفاتحہ اور بقرہ میں ربط بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :

ا۔ سورۃ الفاتحہ میں اھدنا الصراط المستقیم دعا مانگی گئی تھی اور سورۃ بقرہ کی شروع کی پانچ آیات ھُمُ الْمُفْلِحُون تک میں آپ کو بتلایا گیا ہے کہ ہدایت پر کون ہے اور کون نہیں یعنی تم نے جو ہدایت والا راستہ مانگا تھا اس پر چلنے کے لئے یہ اوصاف اپنانے ہوں گے ۔

۲۔ سورۃ فاتحہ میں ایک تو مومنین منعم علیہم کا ذکر تھا جو انبیاء ،شہداء وغیرہ تھے اور دو کافرقوں کا بیان تھا، المغضوب علیہم جو یہود ہیں ،الضالین جو نصاریٰ ہیں ، یہاں سورۃ بقرۃ کی ابتداء میں تین فرقوں کا ذکر ہے ،مومنین کا ذکر ھُمُ المفلحون تک ۔ولھم عذاب عظیمٌ تک دو آیتوں میں کفار طحرین کا ذکر ہے ،پھر دوسرے رکوع کی ابتداء سے آخر تک منافقین کا ذکر ہے ،یہ بھی کافر ہیں ،جیسا کہ ارشاد ہے وماھم بموٴمنین یہ دو وجوہات ربط کی ہوگئیں ،اگرچہ مفسرین نے اور بھی بہت سی وجوہات بیان کی ہیں ،لیکن یہ دو کافی ہیں ۔(۱۴)

(۷)شان نزول :۔ فاضل مصنف آیات کی تفسیر کرتے ہوئے اکثر مقامات پر شان نزول بھی بیان کرتے ہیں ،مثلاً آیت یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الشَّھْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْہِ ط (۱۵) کی شان نزول

بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"واقعہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ایک جماعت کو قتال کے لئے بھیجا تو وہ جمادی الثانیہ کی آخری تاریخ تھی ،رجب داخل نہ ہوا تھا ،رجب شہر حرام ہے ۔مسلمانوں نے سوچا کہ جمادی الثانیہ کے آخری ایام ہیں ،اس لئے قتال کی اجازت ہے ،انہوں نے قتال کیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ چاند ہو گیا تھا تو اس پر کافروں نے بڑا شور مچایا کہ یہ عجیب قسم کے لوگ ہیں کہ اشہر حرم کا احترام بھی نہیں کرتے اور دیکھو یہ حضور ﷺ اپنے لوگوں کو قتل اور لوٹ مار کا حکم دیتے ہیں ۔مسلمانوں نے یہ واقعہ حضور ﷺ کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ ہم نے جرم کیا ہے ،اس لئے ہم عفو کے مستحق ہیں یا نہیں ؟اس پر یہ آیت اتری"(۱۶)

اسی طرح سورۃ عبس کی ابتدائی آیات کا شان نزول بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ عتبہ بن ربیعہ ،ابوجہل اور حضرت عباسؓ تینوں کو بٹھا کر انہیں دین اسلام کی دعوت دے رہے تھے اور دین متین کی حقانیت سمجھا رہے تھے ،اتنے میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم آگئے ،یہ نابینا صحابیؓ تھے ،انہوں نے حضور ﷺ سے ایک آیت کے الفاظ یا مفہوم سے متعلق پوچھا کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ نے جو علم آپؐ کو دیا ہے ،اس میں سے مجھ کو سکھلا دیجئے ،اثنائے کلام میں حضرت عبداللہؓ کی یہ مداخلت اللہ کے رسول ﷺ کو ناگوار گزری اور آپؐ کے چہرہ انور پر ناراضی کے آثار صاف نظر آنے لگے ،حضور ﷺ برابر عظماء قریش کی طرف متوجہ رہے اور ان سے گفتگو فرماتے رہے تھے ،یہاں تک کہ جب وہ مجلس ختم ہوگئی اور آپؐ گھر تشریف لے جانے لگے تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ عبس نازل فرما دی اور آپؐ کو بتلا دیا کہ توجہ کرنا چاہیے تھی اور جس لحہ یہ آپؐ سے حصول علم کے خواست گار تھے ،اسی وقت ان کو فیض نبوت سے مستفید ہونے کا موقعہ ملنا چاہیے تھا"(۱۷)

(۸)تفسیر القرآن بالقرآن:۔ قرآن کا قاری اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اس میں ایجاز بھی ہے اور اطناب بھی ،اجمال بھی ہے اور تبیین بھی ،یہ مطلق ومقید اور عام وخواص سبھی کو شامل ہے ،جو چیز ایک جگہ مختصراً بیان ہوئی ہے ،دوسری جگہ تفصیلاً مذکور ہے اور جو چیز ایک اعتبار سے مطلق ہے وہ

دوسری جگہ دوسرے پہلو سے مقید ہے ،جو چیز ایک آیت میں عام ہے ،دوسری آیت میں خاص ہے ،لہٰذا جو شخص قرآن کی تفسیر کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک موضوع میں وارد ہونے والی تمام مکرر آیات کو جمع کرکے ان کا تقابل کرے ،یہی تفسیر القرآن بالقرآن ہے لہٰذا مفسرین کے نزدیک القرآن یفسر بعضہ بعضاً۔اس اصول کے مطابق مولانا مفتی محمود بھی بہت سے مقامات پر قرآنی آیات کی تفسیر قرآن حکیم میں موجود دیگر آیات کی مدد سے ہی کرتے ہیں ،مثلاً آیت وَاِذْ قَالَ مُوْسیٰ لِقَوْمِہٖ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً ط (۱۸) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا ضابطہ اور قانون فطرت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ایک حکم کو مطلق چھوڑ دیں اور اس کے ظاہر پر عمل ممکن ہو تو پھر خواہ مخواہ تعمق میں پڑ کر طرح طرح کے سوالات کرنا بے ادبی بھی ہے اور اپنے لئے دائرے کو تنگ کرنے والی بات بھی ہے ،چنانچہ ارشاد ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَلَکُمْ تَسُؤْکُمْ ج وَاِنْ تَسْئَلُوْا عَنْھَا حِیْنَ یُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَلَکُمْ ط عَفَا اللّٰہُ عَنْھَا ط (۱۹) ''اے ایمان والو نہ سوال کیا کرو ایسی باتوں کی نسبت اگر ظاہر کردی جائیں تم پر تو تمہیں تکلیف ہو،اور اگر تم پوچھو ان کی بابت جبکہ قرآن نازل ہورہا ہو تو وہ ظاہر کردی جائیں تم پر۔درگزر کیا اللہ نے ان سے ''۔(۲۰)

اسی طرح سورۃ الاعراف کی آیت وَاْمُرْ قَوْمَکَ یَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِھَا (۲۱) ''(اے موسیٰ) اپنی قوم کو حکم کرکہ اس (تورات) کی اچھی باتوں پر عمل کریں'' یہاں بظاہر یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ تورات کتاب اللہ ہونے کی وجہ سے تمام اچھی باتوں پر مشتمل تھی تو پھر کیسے فرمایا گیا کہ یاخذ باحسنھا جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں اسم تفضیل کا صیغہ استعمال فرمایا گیا ہے جو اس بات کی طرف مشیر ہے کہ بعض باتیں حسن ہیں اور بعض احسن ہیں ،جیسے قرآن حکیم میں ارشاد ہے وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْھَآ اَوْ رُدُّوْھَا (۲۲) ''اور جب تمہیں دعا دی جائے سلامتی کی تو اسے بہتر دعا دو یا وہی لوٹا دو'' اگر کوئی شخص دوسرے سے کہے السلام علیکم ورحمۃ اللہ تو جواب میں کہے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ تو یہ جائز (حسن) ہے اور اگر جواب میں کہے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ تو یہ احسن ہے۔(۲۳)

(۹) تفسیر القرآن بالحدیث: تفسیر قرآن کا ماخذ ثانی حدیث ہے ،اس لئے فاضل مصنف اکثر مقامات پر آیات کی تفسیر کرتے ہوئے احادیث سے استفادہ کرتے ہیں ، مثلاً آیت وَاَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْئَتُہٗ (۲۴) کی تفسیر میں یہ حدیث نقل کرتے ہیں ''جب کوئی مومن گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ ہو جاتا ہے ،پھر اگر وہ اس گناہ سے توبہ کرلیتا ہے اور استغفار کرتا ہے تو اس کا دل (اس نقطہ سیاہ سے)صاف کردیا جاتا ہے اور اگر زیادہ گناہ کرتا ہے تو وہ سیاہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے ،یہاں تک کہ اس کے دل پر چھا جاتا ہے (۲۵) پس یہ ران یعنی زنگ ہے ،جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ،یوں ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر یہ اس چیز (گناہ) کا زنگ ہے جو وہ کرتے تھے (یہاں تک کہ ان کے دلوں میں خیر اور بھلائی بالکل نہیں رہی) (۲۶)

اسی طرح سورۃ یونس کی آیت لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃٌ (۲۷) یعنی اللہ کے نیک بندوں کو جنت بھی ملے گی اور کچھ زائد بھی ،کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''زیادت کی تفسیر صحیح احادیث میں دیدار خداوندی سے کی گئی ہے ،حضرت صہیبؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا جب جنت والے جنت میں اور جہنم والے جہنم میں چلے جائیں گے تو جنت میں ایک منادی آواز دے گا کہ تم لوگوں سے اللہ تعالیٰ کا ایک وعدہ ہے ،اللہ تعالیٰ اسے پورا کرنا چاہتے ہیں ،لوگ سوال کریں گے کیا اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر نعمت سے سرفراز نہیں فرمایا؟ کیا اللہ تعالیٰ نے ہمارے چہرے نورانی نہیں بنائے ؟ پھر اللہ تعالیٰ تجلیات اٹھالیں گے اور تمام اہل جنت دیدار خداوندی سے لطف اندوز ہوں گے اور دیدار خداوندی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہ ہوگی ،اس دیدار سے اہل جنت کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی'' (۲۸)

(۱۰) فقہی احکام کا استنباط: چونکہ فقہ فاضل مصنف کا مستقل موضوع ہے اور فقہ کے حوالے سے آپ مفتی کہلائے ،بلکہ مفتی تو گویا آپ کے نام کا جزء ہوگیا ،اس لئے آپ احکام وشرائع کے حوالے سے کمال درجے کی بحث فرماتے ہیں ،خصوصاً عصر حاضر کے جدید اور سائنسی وسیاسی مسائل پر انتہائی بصیرت کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں ،مثلاً ''رجم میں پتھروں کی جگہ گولیوں کی بوچھاڑ'' سے متعلق مسئلے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"بعض علماء کی مجلس میں یہ بات ہوئی کہ فی زمانہ رجم کیسے کرنا چاہیے؟ یہ بحث آئی کہ اگر پتھروں کی جگہ گولیوں کی بوچھاڑ کردی جائے تو یہ رجم ہوگا یا نہیں؟ میں نے اس بات کی مخالفت کی اور کہا کہ پتھر ہی مارنے چاہئیں اور دلیل یہ دی کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ رجم حدود میں سے ہے اور حدود کے لئے قانون یہ ہے کہ الحدود تندری بالشبہات یعنی ثبوت جرم میں شبہ ہوجانے کی وجہ سے حدود ختم ہوجاتے ہیں اور ان کا حکم لاگو نہیں ہوتا لہٰذا اگر کوئی زنا کا اعتراف کرلے اور اس کو سنگسار کرنا شروع کردیا جائے اور وہ شخص اپنے اعتراف واقرار سے پھر جائے تو پھر اس کو چھوڑ دیا جائے گا اور مزید سزا نہ دی جائے گی، جیسے ماعز بن مالک اسلمیؓ بھاگ گئے تھے۔ ایک شخص نے اونٹ کی ہڈی اٹھائی اور ماردی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب بھاگ گیا تو اس کا بھاگنا رجوع کے حکم میں ہے۔ اسی طرح جس کے خلاف چار گواہ ہوں تو ان کے سامنے رجم کیا جائے تاکہ گواہ اس سختی کو دیکھ کر خدانہ خواستہ اگر انہوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہو تو نرم پڑ جائیں۔ البتہ شہادت سے رجوع کے بعد ان پر حد قذف اسی[۸۰] کوڑے لگائے جائیں گے اور گولیوں کی بوچھاڑ کے بعد مندرجہ بالا صورتوں میں سے کوئی صورت ممکن نہیں، نہ گواہ کے لئے اور نہ خطا کے لئے لہٰذا اس صورت میں گولیوں کی بوچھاڑ کی سزا قطعاً درست نہیں ہے۔ آج سعودی عرب والے پتھر نہیں مارتے، وہ چھرے مارتے ہیں، اس میں بھی تھوڑی سی گنجائش ہے، لیکن گولی والی صورت تو بالکل جائز نہیں ہے"(۲۹)

اس سلسلے میں جن دیگر جدید اور سائنسی مسائل پر آپ نے روشنی ڈالی ہے، ان میں مشینی ذبیحہ (۳۰) خاندانی منصوبہ بندی (۳۱) خلائی اسٹیشن کا قیام (۳۲) لاؤڈ سپیکر کا استعمال (۳۳) رویت ہلال کمیٹی (۳۴) وغیرہ شامل ہیں۔

(۱۱) مروجہ قوانین پر بحث: تفسیر محمود کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس تفسیر کے فاضل مصنف ملک میں رائج قوانین پر بھی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں، مثلاً "شرعی عدت اور ہمارے عائلی قوانین" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

"ہمارے عائلی قوانین میں عورت کی عدت کے لئے ۹۰ دن مقرر ہیں۔ آگے اس کی کوئی تفصیل ہے نہ وضاحت۔ حالانکہ حیض کے ذریعہ گزرنے والی عدت ۳۹ دن بھی ہوسکتی ہے

اور یہ کم سے کم مدت ہے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ اگر طہر کے اختتام پر طلاق دی ہو اور متصل ہی حیض شروع ہوجائے اور یہ بات سب پر عیاں ہے کہ حیض کی کم از کم مدت ۳ دن اور طہر کی کم از کم مدت ۱۵ دن ہے۔ تو پہلے حیض ۳ دن پھر طہر ۱۵ دن، پھر حیض ۳ دن پھر طہر ۱۵ دن پھر تیسرا حیض ۳ دن، یہ کل ۳۹ دن ہوگئے۔ گویا عدت کی کم از کم مدت ۳۹ دن ہوسکتی ہے، لیکن عائلی قوانین بنانے والوں نے ۹۰ دن مقرر کئے ہیں۔ یہ اب بھی بضد ہیں۔ کسی کی بات سننے اور سمجھنے کے روادار نہیں ہیں، لیکن یہ انتہائی بے وقوفی کی بات ہے۔ عدت کو ۹۰ دن کے ساتھ خاص کرنا صریح نص کے مخالف ہے۔ یہ ۹۰ دن والی عدت صرف دو قسم کی عورتوں کی عدت ہوسکتی ہے، اول جس لڑکی کو صغرسنی کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو، دوم جس عورت کو بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو۔ پھر مزے کی بات یہ ہے کہ جو عورت غیر مدخول بہا ہو اور اسے طلاق دی جائے تو اس کی عدت ہے ہی نہیں، لیکن عائلی قوانین میں اس کے لئے بھی ۹۰ دن مقرر ہیں۔ یہ صریح نص کی مخالفت ہے لیکن وہ لوگ بضد ہیں، اب اس قانون کو بدلتے بھی نہیں"۔(۳۵)

اس سلسلے میں جن دیگر مروجہ قوانین کو آپ زیر بحث لائے ہیں، ان میں کلیدی عہدوں پر غیر مسلموں کی تقرری (۳۶) پاکستانی قانون میں پوتے کی وراثت (۳۷) وغیرہ جیسے اہم مسائل شامل ہیں۔

(۱۲) شبہات کا مدلل جواب: فاضل مصنف اپنی تفسیر میں مختلف ذہنوں میں پیدا ہونے والے شبہات کا مدلل انداز میں جواب دیتے ہیں، مثلاً جہاد اکبر واصغر سے متعلق شبہہ کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آج کل ہمارے نوجوان اس بات میں شبہ کرتے ہیں کہ دیگر اعمال کے مقابلے میں جان کی بازی لگانا اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر اس کو قربان کرنا کتنی بڑی قربانی ہے، لیکن پھر بھی اس کو جہاد اصغر کہا گیا، آخر کیوں؟ یہ عجیب سی بات ہے، اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ نفس کے تقاضوں کو علی الدوام کنٹرول کرنا یہ بہت مشکل کام ہے۔ کوئی شخص اس کو پابندی سے سرانجام نہیں دے سکتا، لیکن جہاد میں کود جانا آسان ہے۔ بسا اوقات انسان جذبات میں آکر قتل ناحق

کا مرتکب ہوتا ہے جیسا کہ اللہ کے رسول کا ارشاد ہے القاتل و المقتول کلاھما فی النار (۳۸) یعنی مارنے والا اور مارا جانے والا دونوں جہنم میں جائیں گے ۔جان دینا آسان ہے لیکن ہمہ وقت نفس پر کنٹرول کرنا بڑا مشکل ہے ۔آپ لوگوں نے دیکھا نہیں کہ معمولی پریشانی کی وجہ سے لوگ خودکشی کر لیتے ہیں ۔بچے امتحان میں فیل ہوا تو طعنہ کے خوف سے خودکشی کر لی ۔یہ بچہ دراصل اپنے نفس پر کنٹرول نہ کر سکا لیکن یہ اپنی جان دینے کو تیار ہوگیا، لوگ اس کٹھن کو جان دینے پر فوقیت دیتے ہیں ۔مشکلات پر مسلسل قابو رکھنا ضبط نفس ہے ۔کئی دفعہ آدمی صرف بھوک سے عاجز آکر بیوی بچوں کو قتل کر دیتا ہے ۔اس لئے کہ جان دینا آسان ہے ۔بہت سے لوگ روزے اس لئے نہیں رکھتے کہ ان میں برداشت نہیں ہے ۔مسلسل مشکلات کو اپنانا یہ جہاد اکبر ہے ۔اسی لئے یہ فرمایا کہ جہاد اکبر تو سر کرلو جہاد اصغر پھر کر لیا "(۳۹)

خلاصہ یہ کہ تفسیر محمود بہت سی خصوصیات کی حامل تفسیر ہے ،خاص کر مختلف فقہی مسائل اس میں بکثرت بیان ہوئے ہیں ۔

حوالہ جات

(۱) حبیب الرحمن شامی مدیر قومی ڈائجسٹ (مفتی محمود نمبر) لاہور، ج ۳ ش ۹ فروری ۱۹۸۱ء، ص ۴۵۔

(۲) اس سلسلے میں قومی اسمبلی کی تفصیلی کاروائی کے لیے ملاحظہ ہو: مولانا اللہ وسایا (مرتب کنندہ) قومی اسمبلی میں قادیانی مقدمہ (تاریخی قومی دستاویز ۱۹۷۴ء) ملتان ،عالمی مجلس تحفظ ختم نبوۃ ،اشاعت دوم ۱۹۹۶ء۔

(۳) حضرت مولانا خواجہ خان محمد :"ان کے یہ قیمتی کارنامے ۔۔۔"بحوالہ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ ،مفتی محمود نمبر ،ص ۱۱۲۔

(۴) مولانا مفتی محمود کی تفصیلی حالات زندگی اور خدمات کے لئے ملاحظہ ہو: عبدالحکیم اکبری ،مولانا مفتی محمود کی علمی دینی اور سیاسی خدمات ،ڈیرہ اسمٰعیل خان ،مکتبہ الحمید ۲۰۱۰ء۔ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ (مفتی محمود نمبر) لاہور ،ج ۳ ش ۹ فروری ۱۹۸۱ء، ہفت روزہ ترجمان اسلام (مفتی محمود نمبر) ،لاہور ،شیرانوالہ گیٹ ،ج ۲۳ ش ۱۶، ۱۷ اپریل ۱۹۸۱ء۔

(۵) مولانا ایوب جان بنوری :"ایک مرد قلندر۔۔۔"بحوالہ قومی ڈائجسٹ ،مفتی محمود نمبر ،ص ۱۱۷۔

(۶) مولانا عبیداللہ انور :"مفتی صاحب کو یقین ہوگیا" قومی ڈائجسٹ ،ص ۱۴۱۔

(۷) محمد ریاض درانی وغیرہ (مرتبین) تفسیر محمود ،لاہور ،جمعیت پبلی کیشنز ،۲۰۰۷ء ج ۱: ص ۴۳ ۔ ۴۵ ۔

(۸) ایضاً ، ج ۱: ص ۳۵.

(۹) ال عمران ۳:۱۴۳

(۱۰) تفسیر محمود ، ج ۱: ص ۳۸۹، ۳۹۰

(۱۱) ایضاً ، ج ۱: ص ۴۸۰

(۱۲) ایضاً، ج ۱: ص ۲۱۰، نیز مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ج ۱: ص ۲۸۰، ۲۹۸، ۲۱۰، ۲۱۹، ۲۴۰، ۲۹۷، ج ۳: ص ۹۹، ۱۳۸

(۱۳) ایضاً ، ج ۳، ص ۱۱۵ ، مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ج ۱: ص ۱۹۷، ۲۵۵، ۲۵۷

(۱۴) ایضاً ، ج ۱: ص ۱۳۸، ۱۳۹.

(۱۵) البقرۃ ۲: ۲۱۷.

(۱۶) تفسیر محمود ، ج ۱: ص ۳۳۱، ۳۳۲، اس بات کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو محمد عبدالملک بن ھشام ،السیرۃ النبویۃ ، کوئٹہ ،مکتبہ معروفیہ ، ج ۱: ص ۳۵۵ ۔ ۳۵۷

(۱۷) تفسیر محمود ،ایضاً ، ج ۳: ص ۴۳۰ ، یہ روایت (الفاظ کے تغیر کے ساتھ) سنن ترمذی میں موجود ہے ،ملاحظہ ہو: ابواب التفسیر ،تفسیر سورۃ عبس ۔

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر محمود ، ج ۱: ص ۲۹۷، ۳۵۸، ۲۹۳ ، ج ۲: ص ۱۴۳، ۲۵۰ ، ج ۳: ص ۹۸.

(۱۸) البقرۃ ۲: ۶۷

(۱۹) المائدۃ ۵: ۱۰۱

(۲۰) تفسیر محمود ، ج ۱: ص ۴۳۹.

(۲۱) الاعراف ۷: ۱۴۵

(۲۲) النساء ۴: ۸۲

(۲۳) ایضاً ۴: ۹۸

(۲۴) البقرۃ ۲: ۸۱.

(۲۵) سنن ترمذی ،ابواب التفسیر ،تفسیر سورۃ المطففین ۔

(۲۶) تفسیر محمود ۱: ۴۴۸،

(۲۷) یونس ۱۰: ۱۹

(۲۸) تفسیر محمود ، ج ۳: ص ۲۰۲. حدیث کے لئے ملاحظہ ہو صحیح مسلم ، کتاب الایمان باب اثبات رؤیۃ المؤمنین فی الآخرۃ لربھم

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر محمود ، ج ۱: ص ۲۵۹، ۴۰۲، ۴۵۰، ۴۹۵، ۵۱۳، وغیرہ۔

(۲۹) ایضاً، ج۱: ص۲۷۵.

(۳۰) ایضاً، ج۱: ص۵۴۳.

(۳۱) ایضاً، ج۲: ص۵۴.

(۳۲) ایضاً، ج۲: ص۴۹۷.

(۳۳) ایضاً، ج۲: ص۳۹۵.

(۳۴) ایضاً، ج۳: ص۱۵۷.

(۳۵) ایضاً، ج۱:ص۲۲۱،۲۲۴۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ج۱:ص۲۲۱، ۲۲۵، ۲۳۶، ۲۴۲، ۲۴۲، ۲۴۳.

(۳۶) ایضاً، ج۱:ص۲۳۵.

(۳۷) ایضاً، ج۱:ص۲۴۲_۲۴۳.

(۳۸) صحیح بخاری، کتاب الایمان باب المعاصی من امر الجاهلیة.

(۳۹) تفسیر محمود، ج۱:ص۲۷۷، مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ج۱:ص۹، ۱۳، ۱۵۱_۱۵۹، ۲۲۲، ۲۲۵، ۲۴۱، ۲۹۳،

ج۳:ص۳۷، ۱۱۹_۱۴۱

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد۶، شمارہ۱۸، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

علامہ محمد حسین طباطبائی ...... صاحب تفسیر المیزان

ڈاکٹر زاہد علی زاہدی

Allama Muhammad Hussain Tabatabai has written one of the most valuable exegesis of Quran in the name of "Al Mizan fi Tafseer ul Quran" in Arabic language in 20 volumes. Allama Tabatabai was born in Tabrez, Iran. He has received his basic education from his home town then he moved to Najaf, Iraq where he learned Islamic Philosophy, Islamic Jurisprudence and Principles of Jurisprudence from renowned scholars. He has written many books on history, jurisprudence and doctrine of Islam but he is well known for his works on Islamic Philosophy. His annotations on Mulla Sadra Sherazi's al Asfar and his two books, Bidayatul Hikmah and Nihayatul Hikmah for the students of Islamic Philosophy are notable works but his remarkable work on Islamic Philosophy

is Usool-e-Falsafah wa Rawish-e-Rialism (the Principles of Philosophy and the methodology of Realism) a critical and comparative work on Western Philosophy and Muslim Philosophy.

In this article the biography of Allama Tabatabi has been discussed in length. His scholarly works, his teachers as well as students have been mentioned. It is notable that most of the teachers and scholars of Islamic Philosophy of present Iran and the leaders of Islamic revolution of Iran are students of Tabatabai including Mutahheri, Khamenei, Muntazari, Makarim Sherazi, Beheshti and Bahonar. Prof. Henry Corbin and Dr. Hosein Nasr of American Universities are also among his disciples. Also his marvelous commentary on Holy Quran Al-Mizan has been discussed with three dimensions i.e. Tafseer Quran bil Quran (Exegesis of Quran with the help of Quranic verses), the sociological aspects of Al-Mizan and the Philosophical aspects of Al-Mizan. These aspects givespecial status to tafseer Al Mizan.

ایران کے شمالی مغربی صوبہ آذربایجان کا مرکز اور تاریخی و علمی شہر تبریز ایک مردم خیز سرزمین ہے جہاں بڑی بڑی علمی شخصیات پیدا ہوئیں اور انہوں نے دنیا بھر میں شہرت حاصل کی۔ علامہ امینی صاحب الغدیر اسی شہر کا سرمایہ ہیں۔ جس شخصیت کا تعارف اس مقالہ میں کرایا جارہا ہے وہ بھی اسی شہر تبریز میں ایک سادات اور علمی گھرانہ میں ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے (۱) یعنی علامہ سید محمد حسین طباطبائی جو والد کی طرف سے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اور والدہ کی

طرف سے امام حسین علیہ السلام کی اولاد ہیں اور اپنے اجداد میں سے ایک نمایاں بزرگ ابن طبا طبا کی اولاد ہیں جنہوں نے بنی عباس کے زمانے میں قیام کیا اور درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔(۲) آپ کے دادا شیخ محمد حسین نجفی نے چالیس جلدوں میں فقہ استدلالی پر ایک معرکۃ الآرا کتاب جواہر الاکلام فی شرح شرائع الاسلام لکھی جو کہ علامہ حلی کی شرائع الاسلام کی شرح ہے۔ علامہ طباطبائی ابھی پانچ سال کی عمر میں تھے کہ والدہ رحلت فرما گئیں اور بعد ازاں جب آپ نو سال کی عمر میں پہنچے تو والد ماجد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بچپن اور جوانی میں اسی شہر میں تحصیل علم کیا اور بعد ازاں نجف اشرف چلے گئے جو کہ اس زمانہ میں عالم تشیع کا سب سے بڑا علمی مرکز تھا۔اپنے بچپن کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں کہ "ابتدا میں جب میں صرف ونحو پڑھتا تھا تو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا اور پڑھائی میں دل بھی نہیں لگتا تھا لیکن پھر خدا کی ایسی عنایت ہوئی کہ ایک دم سب کچھ سمجھ میں آنے لگا اور پھر میں اس طرح ہر درس میں بیٹھتا تھا کہ کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ استاد کی کوئی بات میری سمجھ میں نہ آئی ہو یا استاد کی کسی بات میں اشکال پیدا ہوا ہو۔ نہ ہی میں استاد سے زیادہ سوال کیا کرتا تھا۔ الحمد للہ سترہ سال تک اسی طرح تعلیم حاصل کرتا رہا کہ کبھی تھکن کا احساس نہیں ہوا۔ بعض اوقات رات رات بھر مطالعہ کرتا یہاں تک کہ صبح ہو جاتی لیکن تھکن کا احساس نہیں ہوتا تھا۔" (۳)

وہ خود ایک مقام پر کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں مدارس میں نصاب کی موجودہ شکل نہیں ہوتی تھی بلکہ مختلف کتاب کی صورت میں طلاب کو پڑھایا جاتا تھا جس میں سرفہرست قرآن کریم تھا۔ بعد ازاں میں نے گلستان وبوستان، سعدی شیرازی،نصاب الصبیان ، انوار سہیلی ، اخلاق مصور، تاریخ معجم ،منشات امیر نظام و ارشادالحساب کی تکمیل کی۔ اس کے بعد عربی ادب کی باری آئی تو امثلۃ ،صرف میر وتصریف نحو میں العوامل فی النحو ، انموذج ،صمدیۃ ، الفیۃ ابن مالک ہمراہ با شرح سیوطی و کتاب نحو جامی ،مغنی اللبیب ابن ہشام وغیرہ پڑھی۔ اس کے ساتھ معانی و بیان میں کتاب المطول تفتازانی، فقہ میں الروضۃ البہیۃ المعروف بہ شرح لمعہ شہید ثانی، مکاسب شیخ انصاری، اصول فقہ میں المعالم فی اصول الفقہ شیخ زین الدین،قوانین الاصول میرزای قمی، رسائل شیخ انصاری، کفایۃ الاصول آیت اللہ آخوند خراسانی، اور منطق میں الکبری فی

المنطق ، الحاشیۃ ،شرح الشمسیۃ ،فلسفہ میں الاشارات و التنبیہات ابن سینا ،علم کلام میں کشف المراد خواجہ نصیر الدین پڑھی اور فلسفہ متعالیہ وعرفان کو تمام کیا۔(۴) ان کتابوں کے نام لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ موجودہ دینی تعلیم کے نصاب میں اور روایتی تعلیمی نصاب میں ایک تقابل ہو سکے اور یہ اندازہ ہو سکے کہ ہمارے بزرگ علماء نے اپنے درسی نصاب میں کن کتابوں کو پڑھا اور کس طرح وہ اس مقام پر پہنچے۔واضح رہے کہ اس زمانے میں تعلیم کا مقصد نہ سند کا حصول ہوتا تھا اور نہ نوکری کا بلکہ صرف اور صرف علم و آگہی کا حصول مقصد تعلیم ہوتا تھا یہی وجہ تھی کہ نہ داخلہ فارم ہوتا تھا نہ امتحان کا انتظام نہ رزلٹ نہ مارکس شیٹ بس تعلیم ہی واحد مقصد تھا۔

نجف اشرف پہنچتے ہی طباطبائی آیت اللہ شیخ محمد حسین اصفہانی کے اصول فقہ کے درس خارج میں شریک ہو گئے اور پھر چھ سال کے بعد آیت اللہ نائینی کے فقہ و اصول فقہ کا دورہ مکمل کیا جس میں آٹھ سال مزید لگے ساتھ ہی علم رجال کے لیے آیت اللہ کوہکری کے دروس میں حاضری دی۔معارف الہیہ ، اخلاق اور حدیث کے لیے آپ نے اپنے زمانے کے عارف کامل آیت اللہ سید علی آقا قاضی طباطبائی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا جن کی سرپرستی میں آپ نے سیر و سلوک ومجاہدات نفسانیہ و ریاضات شرعیہ کے مقامات طے کیے۔(۵)

علامہ محمد حسین طباطبائی کو صاحب تفسیر المیزان کہا جاتا ہے کیونکہ وہ المیزان فی تفسیر القرآن کے مؤلف ہیں جو کہ عالم اسلام کی ایک نہایت بلند پایہ علمی وفلسفیانہ تفسیر ہے جس پر ہم مضمون کے آخر میں تبصرہ کریں گے تاہم علامہ طباطبائی کا نام تفسیر قرآن کے ساتھ ساتھ جس شعبہ میں شہرت دوام رکھتا ہے وہ ہے اسلامی فلسفہ۔ جس طرح مسلمانوں کے دیگر مکاتب فکر میں دینی حلقہ میں فلسفہ رفتہ رفتہ ناپید ہوگیا بلکہ مردود ٹھہرا اسی طرح شیعہ حوزہ ہای علمیہ میں بھی فلسفہ پر برا وقت آیا لیکن امام خمینی اور علامہ طباطبائی نے اس کو زندہ کیا اور بعض حلقوں کی تمام تر مخالفت کے باوجود وہ فلسفہ پڑھاتے رہے اور شاگرد تیار کرتے رہے۔ خود علامہ طباطبائی نے فلسفہ کس سے پڑھا؟ اس بارے میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میرے استاد حکیم اسلامی سید حسین بادکوبہ ای تھے کہ جن سے میں نے منظومہ سبزواری، اسفار و مشاعر سبزواری، اسفار و مشاعر ملاصدرا، شفاء ابن سینا، کتاب اثولوجیای ارسطو، تمہید القواعد ابن ترکہ و اخلاق ابن مسکویہ

کو پڑھا۔ وہ کہتے ہیں کہ استاد باکو بہ ای نے مجھے خاص تربیت دی اور فلسفہ کی گہرائی میں پہنچا دیا اور اس قابل بنایا کہ میں نے ان کی طرح طرز استدلال کو سیکھ لیا اور پھر انہوں نے خود مجھے حکم دیا کہ میں علم ہیئت اور علم نجوم کے لیے استاد بزرگوار سید ابوالقاسم خوانساری کے درس میں حاضری دوں۔ اس طرح میں نے ان سے ہیئت و نجوم کے علاوہ ریاضیات عالی اور علم ہندسہ بھی سیکھ لیا۔(۶)

علامہ طباطبائی نے فلسفہ میں ایسی کتابیں لکھیں جو کہ اس زمانے میں رائج مغربی فلسفہ کا جواب بھی تھیں اور اسلامی فلسفہ کا نصاب بھی۔ مغربی فلسفہ کے رد میں اسلامی فکر کے ساتھ انہوں نے کتاب اصول فلسفہ و روش رئالیسم لکھی جس کو بعد ازاں ان کے ہونہار شاگرد استاد شہید مرتضیٰ مطہری نے اپنے حاشیہ کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ فلسفہ کے طالب علموں کو ملا صدرا کی معروف تصنیف اسفار اربعہ سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے اس کے لیے اسفار کی کئی شرحیں لکھی گئیں ہیں علامہ طباطبائی نے اسفار پر ایک حاشیہ لکھ کر اس مشکل کو آسان کرنے کی کوشش کی پھر بھی نئے طالب علموں کے لیے فلسفہ کے شعبہ میں داخل ہونے میں ایک دشواری کا سامنا رہتا ہے کیونکہ جو کتابیں نصاب میں شامل ہیں وہ بنیادی طور پر نصاب کے لیے نہیں لکھی گئی ہیں۔ یہ مشکل تقریباً علوم اسلامی کے ہر شعبہ میں موجود ہے۔ علامہ طباطبائی نے اس مشکل کو حکمت متعالیہ کی حد تک کم کرنے کی خاطر بدایۃ الحکمۃ اور نہایۃ الحکمۃ لکھی تاکہ طالب علم ابتدائی طور پر اگر یہ دو کتابیں پڑھ لے تو وہ فلسفہ کے عمیق مباحث میں وارد ہوسکتا ہے۔ نجف میں قیام کے دوران آپ نے کئی کتابیں لکھیں:

۱۔ رسالة فی البرهان
۲۔ رسالة فی المغالطة
۳۔ رسالة فی الاعتبار
۴۔ رسالة فی التركيب
۵۔ رسالة فی الاعتباريات (الافكار التی يخلقها الانسان)
۶۔ رسالة فی النبوة مناهات الانسان

بعض معاشی مسائل کے سبب علامہ طباطبائی نے نجف اشرف سے تعلیم مکمل کر کے واپس اپنے شہر یعنی تبریز میں تبلیغ دین کا فیصلہ کیا تاہم خود ان کا کہنا ہے کہ انہیں اس طرح تبلیغ و تحقیق کے مواقع میسر نہیں ہوئے جیسا کہ وہ چاہتے تھے پس انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایران کے علمی اور مقدس شہر قم کا رخ کیا جائے۔ تبریز میں دس سال قیام کے دوران وہ فارغ نہیں رہے بلکہ اس دوران انہوں نے درج ذیل کتابیں لکھیں:

۱۔ رسالة فی اثبات الذات
۲۔ رسالة فی الصفات
۳۔ رسالة فی الافعال
۴۔ رسالة فی الوسائط بين الله و الانسان
۵۔ رسالة فی الدنيا
۶۔ رسالة فی بعدالدنيا
۷۔ رسالة فی الولاية
۸۔ رسالة فی النبوة اين رساله ها در مقايسه بين عقل و نقل است.
۹۔ رسالة فی انساب السادات الطباطبائيين فی آذربايجان

۱۳۲۵ ہجری میں قم آنے کے بعد انہیں وہ روحانی اطمینان حاصل ہوا جس کی انہیں تمنا تھی حالانکہ تبریز میں وہ مادی اعتبار سے فارغ البال تھے اور اپنی آبائی زمین میں کاشت کاری کے ذریعے بہتر مادی زندگی بسر کر رہے تھے۔ قم میں ان کے ابتدائی گھر کے بارے میں ان کے فرزند سید عبدالباقی طباطبائی بیان کرتے ہیں کہ اس میں صرف دو کمرے تھے اور باورچی خانہ نہیں تھا لہٰذا ایک کمرے میں ہی باورچی خانہ بھی قائم تھا۔(۷) لیکن علامہ طباطبائی کا مقصد یہ سب کچھ نہیں تھا اس لیے آپ کو ایسے شاگرد مل گئے جن کی تربیت کے ذریعے انہوں نے اسلامی فلسفہ کو نئی زندگی عطا کی اور آج تقریباً ایک پوری صدی کی محنت کے نتیجے میں فلسفہ بارآور ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی وہ علمی نگارشات سامنے آئی جن کے سبب قم جیسے علمی مرکز میں جہاں بڑے بڑے فقہاء و مجتہدین موجود ہیں جن کی علمی نگارشات سے کتب خانے اور کتاب فروشی

کے عیاف بھرے پڑے ہیں، آپ کے نام کے ساتھ علامہ کا لقب مستقل لگ گیا۔ شیعہ علماء و فقہاء میں علامہ کا لقب علامہ حلی کے بعد علامہ امینی اور علامہ طباطبائی کے نام کے ساتھ لگایا جاتا ہے (البتہ پاکستان اس سے مستثنیٰ ہے جہاں ہر ایک کے ساتھ تمغہ کے طور پر لگا دیا جاتا ہے)۔ قم میں آپ نے درج ذیل کتابیں تالیف کی:

۱۔ المیزان فی تفسیر القرآن، بیس جلدوں میں عربی زبان میں معرکۃ الآرا تفسیر۔

۲۔ اصول فلسفہ و روش رئالیسم، پانچ جلدوں میں مغربی فلسفہ اور اسلامی فلسفہ کا تقابل۔

۳۔ تعلیقۃ علی کفایۃ الاصول، علم اصول فقہ کی کتاب پر حاشیہ

۴۔ تعلیقۃ علی کتاب الاسفار تالیف ملاصدرای شیرازی

۵۔ وحی یا شعور مرموز

۶۔ رسالہ ای در حکومت اسلامی بہ زبانہای فارسی، عربی و آلمانی

۷۔ گفتگو با پروفسور کربن درباره شیعہ جو بعد ازاں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔

۸۔ گفتگو با پروفسور کربن سال درباره نقش تشیع در جہان امروز

۹۔ رسالۃ فی الاعجاز

۱۰۔ علی و الفلسفۃ الالھیۃ، اس کا فارسی اور اردو ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔

۱۱۔ شیعہ در اسلام، تاریخ تشیع پر مختصر لیکن جامع تحریر جو پروفیسر ہنری کربن کی فرمائش پر لکھی گئی۔

۱۲۔ قرآن در اسلام جس میں علوم قرآن اور مقدمہ تفسیر کے موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔

۱۳۔ تعریف شیعہ کے حوالے سے وہ تمام باتیں جو ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر کانٹ مورگان سے دوران گفتگو پیش کی گئیں۔

۱۴۔ سنن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ کو محمد ہادی فقہی نے جس کو ۴۰۰ صفحات میں ترجمہ کیا ہے۔

علامہ طباطبائی قم میں اپنے فلسفہ کے دروس کے علاوہ تہران میں تفسیر قرآن کا درس دیا کرتے تھے جس میں کچھ مخصوص لوگ شرکت کرتے تھے۔ اس درس کے لیے وہ قم سے تہران بس کے ذریعے سفر کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے محسوس کیا کہ ایک ایسی تفسیر کی اشد ضرورت ہے

جو دور حاضر کے علمی چیلنج کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہو البتہ اس کام کے لیے انہوں نے عربی زبان کا انتخاب کیوں کیا؟ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہو کہ وہ چاہتے تھے کہ پورے عالم اسلام کو اس تفسیر سے استفادہ کا موقع مل سکے لہذا انہوں نے عربی میں یہ تفسیر لکھی۔(۸)

اب ہم علامہ طباطبائی کی اس معرکۃ الآرا تفسیر کی بعض خصوصیات پر بحث کریں گے جو کہ کتب تشیع ہی کی نہیں بلکہ عالم اسلام کی ایک بڑی تفسیر ہے۔ بیس جلدوں پر مشتمل المیزان فی تفسیر القرآن علامہ طباطبائی کی محنت شاقہ اور علمی موشگافیوں کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ عالم تشیع کی علمی دنیا میں اس سے پہلے تک علامہ طبرسی کی تفسیر مجمع البیان کا نام سرفہرست تھا تاہم المیزان کی تالیف کے بعد شیعوں کی زائدہ تفسیر المیزان قرار پائی۔ تفسیر المیزان کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تفسیر قرآن بالقرآن ہے۔ یعنی پہلے مرحلے میں ہر آیت کی تفسیر کرنے سے پہلے اس موضوع پر موجود تمام آیتوں کو ایک خاص ترتیب سے جمع کر لیا گیا ہے اور پھر ان آیات سے قرآنی مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ علامہ طباطبائی نے اس روش کو ایجاد کیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ علامہ طباطبائی کی روش تفسیر پر ایک خوبصورت کتاب آقای علی اوسی نے لکھی ہے جس کا نام ہے الطباطبایی و منہجہ فی تفسیرہ المیزان۔ وہ خود کہتے ہیں کہ بعض مواقع پر رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی قرآنی آیت کی تفسیر دوسری آیت سے کی ہے ایک مثال دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ فسر الرسول الأعظم قولہ تعالی: ولم یلبسوا ایمانھم بظلم (انعام/ ۸۲)، لم یلبسوا ایمانھم بالشرک و استدل بقولہ تعالی: ان الشرک لظلم عظیم (لقمان/ ۱۳)۔

دوسرے جملے حضرت علی علیہ السلام سے منسوب ہیں کہ القرآن یشھد بعضہ بعض، القرآن یفسر بعضہ بعضا۔ یعنی قرآن کریم کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی شہادت دیتا ہے۔

ایسی مثالیں بعض صحابہ کرام کی تفسیر میں بھی ملتی ہیں مثلاً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے آیت قالوا ربنا امتنا اثنتین و احییتنا اثنین اور آیت کیف تکفرون باللہ و کنتم امواتا فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم کو ایک دوسرے کا شاہد

قرار دیا۔

علامہ طبرسی، زمخشری اور ابن تیمیہ نے بھی بعض مواقع پر یہی روش اپنائی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ علامہ طباطبائی اس روش کے بانی نہیں ہیں لیکن جس انداز سے انہوں نے پورے قرآن کریم میں اس روش کو پیش نظر رکھا ہے اور ہر ہر آیت کی تفسیر میں اس اصول کو اپنایا ہے کسی اور نے نہیں کیا۔ فرض کریں کسی آیت کی تفسیر میں طبرسی نے بھی دیگر آیتیں پیش کی ہیں اور طباطبائی نے بھی تاہم طباطبائی نے اتنی زیادہ مثالیں پیش کی ہیں اور اس قدر واضح مثالیں دی ہے کہ مطلب زیادہ روشن ہوجاتا ہے اور مجمل بیان مفصل بیان میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اکثر ظاہیر میں کسی آیت سے اگر کئی معنی نکل رہے ہوں تو ایک یا دو معنی پر اکتفا کیا گیا ہے اور زیادہ معانی بیان کرنے سے گریز کیا گیا ہے کہ کہیں تفسیر بالرای نہ ہوجائے۔ اکثر ایک معنی پر دوسرے معنی کو ترجیح دینے کے بجائے ایک سے زائد معنی کو صحیح قرار دینے کی کوشش کی گی ہے تاہم تفسیر المیزان میں اس کے برخلاف بیسیوں معنی ذکر کیے گئے ہیں اور پھر مفسر نے اپنی ترجیح کو دلائل کی مدد سے دیگر مفاہیم پر سبقت دلانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ المیزان میں قرآنی و اسلامی اصطلاحات کی وضاحت کے لیے بھی آیات قرآنیہ کا سہارا لیا گیا ہے۔ مثلاً توحید، دعا، جہاد، رزق، برکت جیسی اصطلاحات جو کہ زبان زد عام ہونے کی وجہ سے بعض اوقات اپنا حقیقی مفہوم کھودیتی ہیں اور معروف معنی میں مستعمل ہونے لگتی ہیں اور جس سے بعض اوقات علمی حلقوں میں بھی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ علامہ نے ان اصطلاحات کے لیے اس طرح قرآنی آیات سے استفادہ کیا ہے کہ ان کا صحیح مفہوم قاری کے ذہن میں اتر جاتا ہے۔

ایک دلچسپ چیز جو کہ المیزان کے ذریعے سامنے آئی وہ یہ کہ تفسیر قرآن بالقرآن کے نتیجے میں آیات کی موضوعی تفسیر بنتی چلی گئی اور اس طرح المیزان ایک تفسیر موضوعی بھی بن گئی۔ المیزان کی خوبی یہ بھی ہے کہ علامہ کے سامنے ہی اس کی عربی اور پھر فارسی میں تین جلدوں پر مشتمل اس کی فہرست موضوعی تیار ہوگئی جس میں موضوعات کے علاوہ اعلام، آیات اور احادیث وغیرہ کی فہرست بھی شامل ہے جس کے مؤلف آقای الیاس کلانتری ہیں۔ المیزان کے سامنے فہرست موضوعی رکھ لی جائے تو المیزان ایک عظیم دائرۃ المعارف کی صورت اختیار کر لیتی

ہے جس میں اسلامی موضوعات پر نہایت علمی مقالے موجود ہیں۔ شاید انہی خوبیوں سے متاثر ہوکر تفسیر المیزان کی کچھ جلدوں کے مترجم اور علامہ طباطبائی کے ایک شاگرد آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی نے تفسیر موضوعی کا سلسلہ شروع کیا ہے جو تا حال جاری ہے۔ اس طرح تفسیر کی ایک نئی قسم سامنے آئی۔

تفسیر المیزان کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تفسیر کے دوران عمرانی علوم کے مباحث کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور شاید یہ اس اعتبار سے واحد تفسیر ہے کہ جو عمرانی علوم کے نقطہ نگاہ سے لکھی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام ایک ایسا دین ہے جس کا تعلق نقط فرد کی انفرادی زندگی سے نہیں ہے بلکہ اسلام ایک معاشرتی دین ہے اور اس کی تمام تر تعلیمات پورے معاشرے کے لیے ہے اور اس حوالے سے قرآن کریم میں بہت کچھ آیا ہے تاہم اب تک اس بارے میں بہت کم کام ہوا ہے۔ کچھ لوگوں نے قرآنی عمرانیات پر کتابیں بھی لکھی ہیں تاہم اب تک کوئی ایسی تفسیر سامنے نہیں آئی جس میں عمرانی پہلوؤں کو خاص اہمیت دی گئی ہو۔ علامہ طباطبائی نے اس اعتبار سے ایک نیا پہلو پیش نظر رکھ کر تفسیر لکھی۔ سب سے پہلے وہ ہر آیت کے موضوع پر دیگر آیات پیش کرتے ہیں، پھر اس موضوع پر احادیث و روایات کو درج کرتے ہیں اور پھر اگر اس کا کسی بھی اعتبار سے عمرانی علوم سے تعلق ہو تو اس کو خاص اس اعتبار سے زیر بحث لاتے ہیں۔

المیزان فی تفسیر قرآن کا تیسرا نہایت اہم پہلو اس کا فلسفیانہ مباحث پر مشتمل ہونا ہے۔ علامہ طباطبائی ایک مفسر کے ساتھ ساتھ فلسفہ کے استاد بھی تھے۔ ان کی کتابیں اصول فلسفہ و روش رئالیسم، بدایۃ الحکمۃ اور نہایۃ الحکمۃ اسلامی فلسفہ اور مغربی فلسفہ پر ان کی گہری نظر کی جانب اشارہ ہے۔ علامہ طباطبائی ان لوگوں میں سے ہیں جو فلسفہ کو شجر ممنوعہ سمجھنے کے بجائے اس کو خدا، کائنات اور انسان کے درمیان ایک عقلی و منطقی رابطہ کی مابعدالطبیعاتی تشریح سمجھتے ہیں۔ لہٰذا جہاں جہاں قرآن کریم میں اس رابطہ کی بحث آئی ہے وہاں انہوں نے بوعلی سینا اور ملا صدرا شیرازی کی راہ پر چلتے ہوئے اس کی فلسفیانہ توجیح پیش کی ہے۔ حکمت اسلامی جس کو حکمت متعالیہ بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ انسان کو خدا تک لے جاتی ہے اور یہ دیگر فلسفیانہ نظریات

سے یکسر مختلف ہے جو انسان کو گمراہ کرتی ہے یا خدا کے وجود کا انکار کرتی ہے اور جس کے رد میں امام غزالی نے تہافۃ الفلاسفہ لکھی۔ المیز ان نے حکمت متعالیہ کو ایک نئی روح عطا کردی ہے اور جو لوگ ہر طرح کے فلسفہ کو دین کا دشمن سمجھتے ہیں ان کے لیے یہ ایک مسکت جواب ہے۔اسی طرح جو لوگ مغربی فلسفہ سے متاثر ہیں اور سمجھتے ہیں انسان اور کائنات کے ارتباط کے بارے میں صرف مغربی فلسفہ تشفی بخش جواب دیتا ہے ایسے لوگوں کو المیز ان کا مطالعہ کرنا چاہئے تاکہ وہ دیکھیں کہ قرآن کریم اس بارے میں کیا کہتا ہے؟

علامہ طباطبائی نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں تفسیری روش کے چار ادوار بیان کیے ہیں۔ پہلا دور یہ بیان کرتے ہیں کہ صحابہ و تابعین نے آیات کے ادبی پہلو، شان نزول، مختصر استدلال اور تاریخی واقعات اور مبدا و معاد کے بارے میں احادیث سے استفادہ کیا۔ بعد ازاں اس میں علم کلام کی بحثیں شامل ہوگئیں۔ دوسری جانب پہلی صدی ہجری کے آخر میں فلسفہ یونان کی آمد سے عقلی مباحث کا آغاز ہوگیا جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وسعت اختیار کرگیا۔ تیسری جانب فلسفیانہ و عقلی مباحث کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں تصوف اور عرفانی مباحث نے بھی اپنی جگہ بنائی جس کے نتیجے میں دینی معارف و حقائق کو لفظی و عقلی دلیل و برہان کے بجائے مجاہدہ و ریاضت نفس کے ذریعے حاصل کرنے کا رجحان پیدا ہوگیا۔ چوتھی سمت یہ ہوا کہ کچھ لوگوں نے قرآنی آیات کو روایات و احادیث کے ظاہری الفاظ ہی کے ذریعے سمجھنے اور ان کے معانی کے ادراک کی بابت آیات کے ادبی پہلوؤں کے علاوہ کسی بھی دوسری جہت میں بحث و تحقیق اور غور و فکر کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔

طباطبائی کہتے ہیں کہ یہ وہ چار عوامل تھے جن کے باعث قرآن مجید کی تفسیر میں علماء و محققین کی روش میں یکسانیت نہ رہی اور سب سے بڑھ کر تفسیر کے باب میں اہل علم تحقیق کی روش و طریقہ بحث کے مختلف ہونے کا سبب ان کے مذاہب و مسالک کا مختلف ہونا تھا اور اسی مذہبی تفرقہ و مسلکی اختلاف کے سبب مسلمانوں کے درمیان کلمہ توحید و رسالت یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے ظاہری الفاظ کے علاوہ کسی بات پر اتفاق رائے قائم نہ ہوسکا اور اس کے علاوہ ہر مسئلہ میں اختلاف رائے پیدا ہوگیا، چنانچہ خداوند عالم کے اسماء مبارکہ، صفات مقدسہ و افعال

کریمہ، آسمانوں اور جو کچھ ان میں ہے، زمین اور جو کچھ اس میں ہے، قضا و قدر، جبر و تفویض، ثواب و عقاب، موت، برزخ، بعث و نشر، قبر سے اٹھنا، قیامت کے دن خدا کی بارگاہ میں حاضری، بہشت و دوزخ، مختصر یہ کہ ان تمام مسائل کے معانی و مفاہیم میں اختلاف نظر پیدا ہوگیا جن کا تعلق کسی بھی پہلو سے دینی حقائق و معارف سے تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل اسلام میں قرآنی آیات کے معانی کو سمجھنے کی روش اور طریقہ بحث میں اختلاف پیدا ہوا اور ہر ایک گروہ نے اپنے مذہب کے مطابق تفسیر قرآن کا مخصوص طریقہ وضع کرلیا۔ (۹)

علامہ طباطبائی نے بعض محدثین کی اس تفسیری روش پر تنقید کی ہے کہ جس میں وہ صرف ان آیات کی تفسیر کرتے ہیں جن کے بارے میں کوئی حدیث یا روایت موجود ہو اور اس کے علاوہ توقف کی پالیسی اختیار کرتے ہیں اور اسی کو تفسیر بالماثور سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کا یہ موقف غلط ہے کیونکہ اس طرح انہوں نے عقل و فکر کی قوتوں کو بے کار کردیا اور تفکر و تدبر کے عمل کو بے سود قرار دے دیا اور صرف روایات و احادیث کے ظاہری الفاظ سے تمسک اختیار کرنے پر اکتفاء کیا جبکہ ایسا کرنا درست نہیں کیونکہ خداوند عالم نے اپنی مقدس کتاب، قرآن مجید میں عقل کو حجت قرار دینے کی ہرگز مخالفت و ممانعت نہیں کی اور نہ ہی عقلی حقائق کو غلط و نادرست قرار دیا ہے اور یہ بات کیونکر ممکن و معقول ہے کہ قرآن عقل و فکر کو حجت قرار نہ دے جبکہ قرآن مجید اور اس کے کلام خدا ہونے کی اصل دلیل ہی عقل ہے لہٰذا صورت حال اس کے برعکس ہے۔ (۱۰)

علامہ سید محمد حسین طباطبائی نے اپنی بھرپور علمی زندگی میں جہاں قابل قدر تصانیف چھوڑی ہیں وہیں اپنے شاگردوں کی بھی ایسی قطار چھوڑ کر گئے ہیں جو ان کے بعد بھی ان کی راہ پہ چلتے ہوئے حکمت اسلامی کی خدمت میں مصروف ہیں اور مزید ہزاروں شاگرد تیار کررہے ہیں۔ ایران کے اسلامی انقلاب کے اہم رہنماؤں کو اگر دیکھا جائے تو زیادہ تر فکری کام کرنے والے امام خمینی اور علامہ طباطبائی کے شاگرد نظر آئیں گے اور یہ دونوں ہی فلسفہ کے اساتید ہیں البتہ امام خمینی نے فلسفہ پر کوئی تصنیف نہیں چھوڑی جبکہ علامہ طباطبائی نے اس حوالے سے اہم کام کئے۔ ایران کے موجودہ رہبر انقلاب آیت اللہ خامنہ ای بھی علامہ طباطبائی کے شاگردوں

میں سے ہیں۔ استاد شہید مرتضیٰ مطہری جن کی فکر کو ایران میں سرکاری طور پر سرپرستی حاصل ہے اور جن کی شہادت پر امام خمینی نے کہا تھا کہ مطہری میری عمر کا حاصل تھا، وہ بھی امام خمینی کے ساتھ ساتھ علامہ طباطبائی کے شاگرد تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام خمینی اپنی سیاسی تحریک کے سبب شاہ ایران کے عتاب کا شکار ہوئے اور طویل عرصہ تک عراق، ترکی اور فرانس میں جلاوطن رہے اس دوران علامہ طباطبائی قم میں جن شاگردوں کی تربیت کر رہے تھے وہ انقلاب کی فکری بنیادوں کی تعمیر میں مصروف تھے اور آج بھی وہ انقلاب کی فکری بنیادوں کے محافظ ہیں۔ استاد مطہری کے بارے میں طباطبائی فرماتے ہیں کہ جب درس میں مطہری آتے تھے تو خود ان کا شوق رتصاں ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسین بہشتی بھی علامہ کے شاگرد تھے جو پارلیمنٹ کے اسپیکر کے عہدے پر فائز ہوئے اور بعد ازاں اپنے بہتر (۷۲) ساتھیوں کے ساتھ حزب اسلامی کے دفتر میں بم دھماکے کے نتیجے میں شہید ہو گئے۔ بہشتی کے جگری دوست اور انقلاب اور پارلیمنٹ کے ساتھی ڈاکٹر باہنر بھی علامہ کے شاگرد تھے اور دونوں ساتھ ہی درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ امام خمینی کے فرزند سید مصطفیٰ خمینی بھی طباطبائی کے شاگرد رشید رہے جن کو نجف میں انقلاب سے قبل شہید کر دیا گیا۔ انقلاب کے ایک اہم شہید استاد مفتح ہیں جو علامہ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ علامہ کے ایک نامور شاگرد امام موسیٰ صدر بھی ہیں جو لبنان کے شیعوں کے انقلابی رہنما تھے اور لیبیا کے ایک سرکاری دورے کے دوران غائب ہو گئے اور جن کا آج تک سراغ نہیں مل سکا۔ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کا ذکر اوپر بھی آ چکا ہے جو کہ علامہ طباطبائی کے بہت قریب رہے ان کی فرمائش پر المیزان کی بعض جلدوں کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا۔ آج کل وہ ایران میں سب سے بڑے مجتہد سمجھے جاتے ہیں اور بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ اس وقت ایران میں دو بہت بڑے فلسفہ کے استاد آیت اللہ جوادی آملی اور آیت اللہ حسن زادہ آملی ہیں یہ دونوں ہی علامہ طباطبائی کے شاگرد ہیں جو اپنی علمی صلاحیتوں سے ہزاروں طالب علموں کی تربیت کر رہے ہیں۔ ایک بڑا نام آیت اللہ مصباح یزدی کا ہے جو بیسیوں کتابوں کے مصنف اور فلسفہ، کلام، تاریخ اور فقہ کے بڑے استاد سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ آیت اللہ حسین حسینی تہرانی، سید جلال الدین آشتیانی، شیخ عباس ایزدی، سید عبدالکریم موسوی اردبیلی، عز الدین زنجانی، ابراہیم امینی،

یحییٰ انصاری، سید محمد باقر الحکمی، حسین نوری ہمدانی، سید مہدی روحانی، علی احمدی میانجی، احمد احمدی، دکتر غلام حسین ابراہیمی دینانی، دکتر سید یحییٰ یثربی کے نام قابل ذکر ہیں۔

علامہ طباطبائی ۱۹۸۱ء کو قم میں طویل علالت کے بعد خالق حقیقی سے جا ملے اور انہیں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں حرم معصومہ قم (۱۱) کے اس گوشہ میں دفن کیا گیا جہاں سینکڑوں علماء و فقہاء آرام کر رہے ہیں اور جس مسجد میں ہزاروں طالب علم ہر وقت علمی مباحثہ میں مشغول رہتے ہیں۔ ہزاروں زائرین جب یہاں معصومہ قم کی زیارت کے لیے آتے ہیں تو علامہ طباطبائی کی قبر پر بھی فاتحہ پڑھتے ہیں۔

حوالہ جات

1.An Introduction to the al-Mizan by Abu al-Qassim Razzaqi, Al-Allamah al-Sayyid Muhammad Husayn al-Tabataba'i (1281 - 1360/1901-1980) is one of the greatest and the most original thinkers of the contemporary Muslim world. (www.quran.org.uk/articles/ieb_quran_almizan.htm)

۲۔ ابن طباطبا ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم بن اسماعیل بن ابراہیم بن حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب علیہم السلام نے سال ۱۹۹ ہجری میں خلافت مامون رشید کے عہد میں عباسی حکومت کے خلاف قیام کیا اور رقہ کے مقام پر زہر سے شہید کر دیے گئے۔ (لغت نامہ دہخدا، www.loghatnameeh.org)

۳۔ http://www.tajalliemalakut.com/Allameh-tabatabaie.aspx

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

۶۔ http://www.azha.ir/showthread.php?tid=106

۷۔ http://www.cgie.org.ir/shavad.asp?id=123&avaid=432

۸۔ اپنی اشاعت کے ساتھ ہی المیزان کا فارسی میں بھی ترجمہ شروع ہوگیا اور عربی میں یہ تفسیر ایران کے علاوہ لبنان سے بھی شائع ہوئی ہے۔ اب تک اس کی تین جلدیں اردو میں آچکی ہیں۔

۹۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱، ص ۲، ترجمہ مولانا حسن رضا غدیری، معراج کمپنی پاکستان، لاہور ۲۰۰۲۔

۱۰۔ ایضاً ص ۳

۱۱۔ حرم معصومہ قم، ایران کے معروف شہر قم میں موجود حضرت فاطمہ معصومہ کے روضے کو کہتے ہیں جو حضرت امام رضا علیہ السلام کی بہن اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی دختر ہیں۔ ان کی قبر کی زیارت کے لیے دنیا بھر سے زائرین سال بھر آتے ہیں۔

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد۹، شمارہ۱۸، اپریل تا ستمبر۲۰۱۲ء

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کے تعلیمی افکار

ڈاکٹر حمیرا ناز

Muslim leaders of sub continent had performed the duty of ideological and epistemological guidance against the colonial power of British Empire through their knowledge, wisdom and action in every walk of life for the revival and restoration of Islamic civilization, and made a history which will no doubt be written in golden words in the history of sub continent, of course it is matter of proud for the Muslim population of Sub Continent. Among these great scholars, leaders of Ummah and history maker personalities, the name of Molana Saeed Ahmed Akber Abadi can not be ignored who played very prominent role in re awakening of the Ummah through their writings and authorship. His major

achievement in this regard was the establishment of NADWATUL MUSANIFFIN furthermore he guided Muslim Ummah through its representative magazine BURHAN in the field of education as well. He wrote long and short essays in BURHAN on educational themes to create educational awareness among Muslim. In present essay, we have collected and compiled his essays on the theme of education and try to evaluate the depth and breadth of his educational views, for which he is placed on seat of great theologian, reformist and educationalist.

ہندوستان میں برطانوی استعمار کے عزائم اور مقاصد سیاسی بھی تھے اور تہذیبی بھی۔ سیاست پر غلبہ وتسلط کے بعد برطانوی حکومت نے تہذیبی اور تعلیمی شعبے کو ہدف بنایا اور ایک نئی زبان، نئی تہذیب اور ایک نئے ثقافتی کلچر کو فروغ دیا جس کا بنیادی مقصد اسلام کو ضعف پہنچانا اور عیسائیت کو تقویت دینا تھا۔اس مقصد کے تحت ایک طرف انگریز حکومت نے ایک ایسا نظام تعلیم اور نصاب وضع کیا، جس کے ذریعے مسلمانوں کے ذہنوں میں اُن کی اپنی تہذیب وتمدن کے بارے میں تشکیک اور مغرب اور مغربی تہذیب کے بارے میں مرعوبیت پیدا کرنا تھا تو دوسری طرف عیسائی مشنری اداروں کی سرپرستی کے ذریعے عیسائیت کو فروغ دینا تھا۔

تاہم یہ ایک خوش آئند حقیقت ہے کہ مسلمان علماء و مفکرین اور تعلیمی ماہرین نے برطانوی استعمار کے مذموم مقاصد کا صحیح ادراک کیا اور اس کے تدارک کے لئے ٹھوس اقدامات کئے ۔ اس حوالے سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، جامعہ ملیہ، دارالمصنفین اور ندوۃ المصنفین اسی طرح کے بیسیوں ادارے ہیں جنہوں نے برطانوی استعمار کے خلاف علمی جدوجہد کی تاریخ رقم کی۔

اس علمی جد وجہد میں ایک نام مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۱۹۰۸ء-۱۹۸۵ء) کا بھی ہے۔ جنہوں نے اپنے قلم و افکار کے ذریعے ملتِ اسلامیہ ہند کی نازک وقت میں رہنمائی کی۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی عصر حاضر کے ایک بڑے عالم اور علوم اسلامیہ پر غائر نظر رکھنے والے علمائے اسلام میں سے تھے۔ مولانا کے تحصیل علم کا سفر دینی درسگاہوں سے لے کر عصری جامعات تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ ایک طرف دارالعلوم دیوبند سے وابستہ تھے تو دوسری طرف ان کا تعلق جدید علمی مراکز سینٹ اسٹیفن کالج اور خاص طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تھا۔ اس طرح قدیم و جدید کے علم کا امتزاج اور ہم آہنگی نے اُن کی شخصیت کو ایک امتیازی مقام عطا کیا، جو آپ کی تحریروں میں نمایاں ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایک کثیر الجہت سیرت و شخصیت کے مالک تھے۔ آپ ایک طرف بلند پایہ عالم دین، محقق، ادیب، مؤرخ اور مدرس و خطیب تھے تو وہیں آپ کی شخصیت کا ایک پہلو ایک مفکر اور مصلح کا بھی ہے۔ آپ نباضِ وقت، خیر خواہ قوم و ملت اور عصر حاضر کے مسائل و تقاضوں کا گہرا ادراک و شعور رکھنے والے باکمال اور نابغہ روزگار شخصیت بھی تھے۔ آپ کا شمار ہندوستان کے اُن اکابرین میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے مسلمانوں میں تعلیمی شعور کو اُجاگر کرنے کے لئے اپنے رفقاء (مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی) کے ساتھ مل کر ایک علمی اور تحقیقی ادارے "ندوۃ المصنفین" کی بنیاد ڈالی اور اس کے ترجمان رسالے برہان کے ذریعے مسلمانوں کی علمی و فکری تربیت اور رہنمائی کا سامان مہیا کرنے کی کوشش کی تاکہ اُن میں حقیقی فکر و عمل کی استعداد پیدا کر کے انہیں روشن دماغ قوم بنایا جا سکے۔ کیونکہ آپ اس بات سے آگاہ تھے کہ مسلمان زندگی کے تمام شعبہ جات میں پیچھے ہیں بالخصوص علمی اور اقتصادی میدان میں۔ لہٰذا اس بناء پر یہ بات عیاں تھی کہ مسلمان اس ملک کے آئندہ سماجی جسم کے ایک مضبوط اور توانا عضو کی حیثیت سے اُس وقت تک ہرگز نہیں رہ سکتے جب تک کہ ان کو اولاً تعلیم اور اقتصادی میدان میں اپنے برادران وطن کے ساتھ چلنے کے قابل نہ بنادیا جائے گا۔ اسی لئے آپ تعلیم کے شعبے میں بے لاگ اصلاحات کے خواہاں تھے۔ اور اسے عصری

تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا اکبر آبادی نے تعلیمی شعبے کی مجموعی صورت حال کا جائزہ لیا اور تعلیمی شعبے کی خامیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی اور تعلیمی مبادیات و مباحث کے تمام جزو کل کو وقت کے حالات و تقاضوں کی روشنی میں پیش کیا۔ مولانا اکبر آبادی نے برہان میں تعلیمی موضوعات پر طویل اور مختصر مضامین اور مقالات تحریر کئے اور ان مقالات و مضامین میں مولانا نے تعلیمی مبادیات، مقاصدِ تعلیم، نظام و نصاب تعلیم، تعلیمی مسائل، قومی تعلیمی پالیسی کو موضوع بحث بنایا ہے ہم ذیل میں مولانا کے ان ہی تعلیمی افکار کا جائزہ لیں گے۔

مقاصدِ تعلیم

تعلیمی شعبے کی اصلاح و تغیر کے حوالے سے مولانا اکبر آبادی کے نزدیک درج ذیل اولین اساسی مقاصد تھے:

(ا) مسلمانوں کو جدید علوم و فنون کی تحصیل کی طرف راغب کرنا، اُن میں تصنیف و تالیف کی اہمیت کو اُجاگر کرنا اور علمی و ادبی ورثہ کے تحفظ اور ترقی کی جانب متوجہ کرانا آپ کے تعلیمی مقاصد میں شامل تھا۔

(ب) عربی زبان کی ترویج و اشاعت بھی آپ کے نزدیک اہم تھی۔

(ج) تعلیم کا اصل منشاء بتاکر ذہن و دماغ کی صحیح تربیت، استوار ذہنیت کا پیدا کرنا اور کیریکٹر بنانا بھی آپ کا مقصود تھا۔ لیکن اس کے لئے آپ علمائے کرام کی ذمہ داری سمجھتے تھے۔

(د) علمی ذوق کو پروان چڑھانے کے لئے مسلمانوں کو علمی تحقیق و تفتیش کی طرف راغب کرانا بھی آپ کے پیش نظر تھا۔

مقاصد تعلیم۔ تشریح و توضیح:

مولانا اکبر آبادی نے مذکورہ بالا مقاصد کی تشریح و توضیح بھی کی اور ہر نکتے کی وضاحت بھی کی ہے۔

(ا) علمی و ادبی متروکات کی حفاظت اور جدید علوم و فنون کی تحصیل:

مولانا اکبر آبادی نے مسلمانوں کو زندہ قوم بننے کے لئے اپنے پرانے سرمایہ علم و فنون کی حفاظت اور دوسری جانب جدید علوم و فنون اور عصری ادبیات میں زیادہ سے زیادہ کمال پیدا کر کے اپنے ملکی ذخیرہ ادب کو ترقی یافتہ بنانے اور اسے وسیع سے وسیع تر بنانے پر زور دیا[59]۔ کیونکہ آپ کی نظر میں یہی اقوام عالم کی ترقی کا راز ہے اور اسی پر تہذیبی اور ثقافتی عظمت کا دارومدار بھی ہے[60]۔ لہٰذا اس کی اہمیت کے پیش نظر آپ نے اپنے قدیم سرمایہ علوم و فنون کی حفاظت کا بندوبست کرنے کے لئے چند تجاویز بھی دی ہیں۔ (۱) آپ نے اس کے لئے عزم و حوصلہ کے ساتھ اُن کی تعلیم کے لئے مدارس قائم کرنے پر زور دیا (۲) اور ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنے کی بھی رائے دی ہے[61]۔ اور اس ضمن میں آپ نے اجتماعی کوششوں کو سودمند قرار دیا اور اس کے لئے مسلمانوں کو ملی تنظیم و تعمیر کا ایک ہمہ گیر پروگرام بنا کر اس کام کو شروع کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا کہنا تھا کہ عربی، فارسی، اُردو کی پرانی کتابوں کو زیادہ سے زیادہ چھاپنے کا بندوبست کیا جائے اور جو انفرادی طور پر یہ کام کرنا چاہیں تو اس سلسلے میں آپ نے متمول ارباب مطبع کو بھی پرانی کتابوں کی طباعت کا زیادہ سے زیادہ انتظام کرنے کی رائے دی ہے[62]

(ب) عربی زبان کی ترویج و اشاعت:

عربی زبان کی اہمیت بیان کرتے ہوئے آپ کا کہنا ہے کہ عربی زبان کو اسلامی کلچر، اسلامی تہذیب، اسلامی روایات کے ساتھ گہرا تعلق ہے[63]۔ لہٰذا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر ہمارا کلچر محفوظ رہے، ہماری روایات زندہ رہیں اور ہماری زندگی میں اسلامیت کا عنصر نمایاں ہو تو آپ کی نظر میں اس کے لئے ہندوستان میں عربی زبان کی ترویج و اشاعت اور اس کی ترقی و تہذیب کے لئے زیادہ سے زیادہ کوششیں کرنا ناگزیر ہوگا۔[64]

عربی زبان کی اس اہمیت کے پیش نظر عربی زبان کی ترقی کا مسئلہ جس قدر اہم اور توجہات کا مستحق تھا مدارس کا اس سے تغافل اور بے پرواہی کا عملاً ثبوت دینے پر آپ نے

افسوس کا اظہار کیا ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ آج ہندوستان کے شہر شہر اور قریہ قریہ میں عربی کی ایک دو نہیں کئی درسگاہیں قائم ہیں۔ جہاں جوق در جوق طلباء سات سات، آٹھ آٹھ سال علوم عقلیہ ونقلیہ کی تعلیم عربی زبان میں حاصل کرتے ہیں پھر ان علوم میں عربی ادب کا بھی کافی حصہ ہوتا ہے اور افصح العرب والعجم کا کلام بلاغت التیام بھی مکرر سہ کرر پڑھا جاتا ہے لیکن ان ہزاروں ہزار عربی پڑھنے والوں میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جن کو واقعی عربی زبان آتی ہے اور جو واقعی عربی کا صحیح مذاق رکھتے ہوں، اس میں تقریر کر سکتے ہوں اور تحریر لکھ سکتے ہوں۔ مولانا یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کسی انگریزی کالجوں میں پڑھنے والے طلباء کو عربی نہیں آتی تو ہم کو ان سے زیادہ شکوہ سنج ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان لوگوں کو عربی محض ضمنی طور پر پڑھائی جاتی ہے البتہ اُن حضرات کی طرف سے کیا معذرت پیش کی جاسکتی ہے جو کئی کئی سال محض عربی میں تعلیم پاتے ہیں اور پھر بھی عربی کی ایک سطر صحیح لکھنے یا ایک جملہ بولنے کی بھی ان میں قدرت نہیں ہوتی ہمیں اپنی اس کوتاہی کا احساس اُس وقت زیادہ ہوتا ہے جبکہ مصر و شام کا کوئی عالم کسی عربی مدرسے میں پہنچ جاتا ہے اُس وقت ارباب مدرسہ کی حیرانی و پریشانی قابل دید ہوتی ہے۔ عام طلباء کا کیا ذکر، مدرسے کے بڑے بڑے اساتذہ بھی اس مصری یا شامی مہمان سے عربی میں گفتگو کرتے ہیں تو بہت رک رک کر، اور ڈر ڈر کر اور اکثر جملے زبان سے غلط نکل جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات ہندوستان کے علماء کی نسبت کوئی اچھا خیال لے کر واپس نہیں جاتے۔[65] لہٰذا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر ان مدارس میں عربی ادب کی تعلیم کا صحیح انتظام ہوتا اور ان کے ذریعے ملک میں عربی زبان کی ترویج و اشاعت کا کام بھی انجام پاسکتا تو آج ہندوستان کے مسلمانوں کی وہ حالت نہ ہوتی جو آج ہے اور نہ ہی یہاں کے انگریزی تعلیم یافتہ احباب کو اسلام اور اسلامیات سے اتنا بعد ہوتا جتنا کہ آج دیکھا جا رہا ہے۔[66]

(ج) تعلیمی ترقی و اصلاح۔ علمائے کرام کی ذمہ داری:

مولانا تعلیمی ترقی و اصلاح کے لئے علمائے کرام کے کردار کو کلیدی قرار دیتے ہیں آپ کے خیال میں علمائے کرام ہی مسلمانوں میں صحیح مذہبی و سیاسی فکر پیدا کر سکتے ہیں اور اس

ضمن میں آپ لٹریچر کی تیاری کو نہایت اہم سمجھتے ہیں [۱۴]۔ مولانا اکبر آبادی نے علمائے کرام کے سامنے ترقیاتی کاموں کا ایک جامع منصوبہ بھی پیش کیا جو درج ذیل نکات پر مشتمل ہے:

۱۔ مدارس عربیہ کے نصاب کی اصلاح کرکے جدید علوم وفنون کو اس میں داخل کرنا۔

۲۔ تعلیم کے لئے ایسے اساتذہ کا انتخاب کرنا جو علوم وفنون میں مہارت کے ساتھ طلباء کی دماغی تربیت کرکے اُن میں مضبوط کیریکٹر بھی پیدا کرسکیں۔

۳۔ عوام کی تعلیم کا بندوبست کرنا، بالخصوص دیہاتوں میں جابجا مفید نصابِ تعلیم کے مدارس و مکاتب جاری کرنا۔

۴۔ ملک میں مذہبی و سیاسی لٹریچر بیش از بیش مہیا کرنا اور کثرت سے اس کو شائع کرنا۔

۵۔ مسلمانوں میں فوجی اسپرٹ اور صحت وتوانائی جسمانی پیدا کرنے کے لئے قریہ بقریہ شہر بشہر ورزش گاہیں قائم کرانا کہ انسان کا جسم تندرست ہوتا ہے تو اس کے خیالات میں بھی علو پیدا ہوتا ہے۔

۶۔ مسلمانوں کا ایک بیت المال قائم کرکے غریب ومفلوک الحال مسلمانوں کے لئے ذرائع معاش مہیا کرنا۔

۷۔ مدارس عربیہ کے علاوہ کالجوں اور یونیورسٹیوں پر قبضہ جماکر وہاں کے طلبہ میں صحیح اسلامی تخیل اور خوب قوی پیدا کرنا۔

۸۔ فضول اور لایعنی رسوم بند کرانے کے لئے محلہ بہ محلہ ایک کمیٹی بنانا کہ وہ اہل محلہ کی نگرانی کرے اور اُن کو فضول ولغو باتوں سے بچائے۔

۹۔ مسجدوں میں ایسے اماموں کا تقرر کرانا جو عالم باعمل اور جدید ضرورتوں سے باخبر ہوں اور وہ ہفتہ میں کم ازکم ایک مرتبہ نو بہ نو مسائل پر مسلمانوں کے سامنے وعظ کہہ سکیں۔

۱۰۔ ملک میں ایسا اسلامی پریس مہیا کرنا جو مسلمانوں کی صحیح نمائندگی اور اُن میں دل و دماغ کی صحیح بیداری پیدا کرے۔ یہ پریس اُردو اور انگریزی دونوں میں ہونا چاہیے۔ [۱۵]

(د) مطالعہ وتحقیق کی ضرورت:

مولانا اکبر آبادی مسلمانوں میں تعلیمی انحطاط کی بنیادی وجہ مطالعہ وتحقیق کے نقدان کو قرار دیتے ہیں آپ کی نظر میں یہ نقدان قدیم اور جدید دونوں طبقوں میں پایا جاتا ہے مولانا نے علمی ذوق کے اس انحطاط ونقدان کے اسباب وعوامل کی نشاندہی بھی کی اور اس کی اصلاح کے لئے چند تجاویز بھی دی ہیں۔ آپ کے خیال میں اس علمی ذوق کے انحطاط ونقدان کی درج ذیل وجوہات ہیں:

۱۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں میں خالص علمی ذوق کا مطالعہ اور شوق نہ ہونے کی وجہ مولانا کے خیال میں ان لوگوں کے پیش نظر اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد آئندہ زندگی کے لئے بہتر سے بہتر راہ اختیار کرنے پر ہوتی ہے اور ان کی ساری علمیت اور قابلیت اسی کے لئے وقف رہتی ہے اور ان کو اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ وہ اپنے اوقات کا ایک قلیل حصہ اپنے ملک کے سنجیدہ اور ٹھوس علمی لٹریچر کے مطالعے کے لئے وقف کرے۔ [۱۶]

۲۔ پھر آپ نے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر جو بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں اور جن کی زندگیاں خالص علم کی خدمت کے لئے وقف ہونی چاہیے ان میں بھی علمی مطالعہ اور تحقیق کا ذوق نہ ہونے کی وجہ آپ نے ان میں عدم دلچسپی کا پایا جانا قرار دیا ہے۔ ان پروفیسرز کے بارے میں آپ کا کہنا ہے کہ جن کی زندگیاں خالص علم کی خدمت کے لئے وقف ہونی چاہیے تھیں اُن میں سے اکثر کا شب و روز اس طرح بسر ہوتا ہے کہ وقت مقررہ پر کلاس روم میں گئے اور اپنی یادداشتوں کی مدد سے جو کچھ انہیں پڑھانا ہے وہ پڑھا دیا۔ اس کے بعد ان کو نہ علمی مطالعے سے کوئی واسطہ اور نہ اپنے ہی مضمون پر تحقیق کرنے سے سروکار، تعلیم وتدریس کے گھنٹوں کے علاوہ ان کے تمام اوقات دوست احباب کی ملاقاتوں، خوش گپیوں اور تفریحات کے لئے وقف رہتے ہیں۔ آپ کو ہندوستان میں کتنے ہی پروفیسر ملیں گے جو بڑی بڑی نامور یونیورسٹیوں میں مختلف مضامین کے استاد ہیں مگر جب کبھی اپنے قلم کی روانی دکھانے

کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے لئے وہ ہمیشہ "افسانہ نگاری" یا "نظم گوئی" کا میدان تلاش کرتے ہیں۔[۳۹]

۳۔ اسی طرح قدیم تعلیم یافتہ طبقے میں مطالعہ وتحقیق کے فقدان کی وجہ مولانا کی نظر میں یہ ہے کہ ان حضرات کا درس و افتاء کی چہار دیواری اور ظواہر احکام کے حصار میں مقید ومحدود رہتا ہے[۴۰]۔ چونکہ ان کی پڑھنے اور پڑھانے کی محدود دنیا ہوتی ہے اور انہیں اس کی خبر نہیں ہوتی کہ باہر دنیا میں علمی کارناموں کی رفتار کیا ہے اور نہ ہی اپنے اسلاف کے علمی تحقیق وتلاش کے سلسلے میں عظیم الشان کارناموں کی خبر ہوتی ہے اور نہ ہی انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کتنے تصنیفی ادارے ہیں اور وہ کیا کیا کام کررہے ہیں۔[۴۱]

مولانا اکبر آبادی نے علمی ذوق اور مطالعہ وتحقیق کے کاموں میں عدم دلچسپی کی اور دوسری وجوہات بھی بیان کی ہیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ:

ا۔ انہی لوگوں میں بڑی اچھی استعداد رکھنے والے بھی ہوتے ہیں لیکن ماحول ایسا بن گیا ہے کہ یہ لوگ اپنی استعداد سے کام لے کر نہ اپنے اوقات کو علمی تحقیق وتفتیش میں صرف کرسکتے ہیں اور نہ وہ اپنے علمی ذوق کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔ کیونکہ مولانا کا کہنا ہے کہ اگر کوئی مدرس ہے تو اسے دن بھر میں آٹھ آٹھ، نو نو مختلف مضامین کے سبق پڑھانے ہوتے ہیں پھر چونکہ تنخواہ کم ہوتی ہے۔ اس بناء پر اخراجات پورا کرنے کے لئے درس کے علاوہ کوئی اور دھندا بھی کرنا پڑتا ہے ظاہر ہے کہ پھر ایسا مصروف شخص اتنا وقت کہاں سے لاسکتا ہے کہ وہ غیر درسی کتابوں کا مطالعہ بھی کرے اور اس کے ذریعے فنی کمال پیدا کرے۔[۴۲]

۲۔ علمی ذوق کے انحطاط وتنزل میں بڑا دخل مولانا اکبر آبادی نے ان نظم کمپنیوں اور شاعروں کی کثرت کو بھی کہا ہے جنہوں نے نہی شاعری کو تباہ کیا ہے۔ ان کے بارے میں مولانا کہتے ہیں کہ جہاں دو چار شعر اُلٹے سیدھے موزوں کردینے کے بعد

حسن ترنم سے مشاعرہ میں ان کو پڑھ دینے سے یا کسی نظم کمپنی میں بہت ہی ارزاں قسم کے گیت اور غزلیں لکھ دینے سے شعروں کو داد ملنی شروع ہوئی اور شاعر نے سمجھ لیا کہ وہ فن کے کمال تک پہنچ چکا ہے اور اب اس کو کوئی غرض نہیں ہوتی کہ فن کا مطالعہ کرے، اساتذہ سے استفادہ کرے، ان کے شعری مجموؤں سے اپنے فن میں نکھار لائے اور اصول فن کا پابند رہ کر مشق سخن بہم پہنچائے۔[۴۳]

۳۔ اس کے علاوہ مولانا کے خیال میں ہر مسجد میں ترجمہ قرآن مجید، مذہبی جلسوں کی بھرمار، کچھ نیم سیاسی انجمنوں کی سرگرمیاں ان سب کو بھی علمی ذوق کے انحطاط و تنزل میں بہت بڑا دخل ہے۔[۴۴]

مولانا اکبر آبادی نے اس علمی انحطاط وتنزل کی نشاندہی کرکے جس کی رفتار آپ کی نظر میں نہایت ہی خطرناک ہے فوری طور پر اس کی اصلاح کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے کیونکہ آپ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ اگر اس کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کی گئی تو عین ممکن ہے کہ ایک وقت ایسا آجائے کہ ہمارے اسلاف کرام کے علمی خزانے تاریخ کا ایک گم شدہ یا فراموش کردہ ورق ہوکر رہ جائیں اور کوئی بھی ایسا نہ نکلے جو ان کے نام سے بھی آشنا ہو اس صورت حال کو آپ قوم وملت کی تہذیب اور اس کے کلچر کی موت کہتے ہیں۔ کیونکہ آپ کی نظر میں ایک قوم کے کلچر اور اُس کا سرمایہ علمی کی موت خود اس قوم کی موت ہے۔[۴۵]

لہٰذا ایسے موقع پر آپ علمائے کرام اور ارباب حل وعقد دونوں کا فرض سمجھتے ہیں کہ وہی اس کے تحفظ اور بچاؤ کا سروسامان کرسکتے ہیں اور اس کا حل تلاش کرسکتے ہیں آپ نے اس کے لئے مختلف تجاویز بھی دی ہیں آپ کا کہنا ہے کہ:

ا۔ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنو ایسی درس گاہوں میں اسلامی تحقیقات کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا جائے جس میں اسلامی علوم وفنون کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کا بڑے سے بڑا ذخیرہ فراہم کیا جائے اور فارغ التحصیل طلباء میں سے دو چار ہونہار، ذہین محنتی اور صاحب ذوق طلباء کا انتخاب کرکے ان سے کسی بڑے عالم اور محقق کی